افسانے
صباحت مشتاق
سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

اعتراف

اعتراف

اشاعتِ اوّل : 2014ء
سرورق : سعیدابراہیم
تعداد : 500
قیمت : 300

AETRAAF
(An Urdu stories book by Sabahat Mushtaq)

Printed by:
Naveed Hafeez Printers, Lahore, Pakistan

Price:
In Pakistan: Rs. 300

Published by:
سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-129-8

انتساب

فہرست

صباحت مشتاق کی کہانیاں

میں نے صباحت مشتاق کی کل تیرہ کہانیاں پڑھی ہیں۔ اگر یہ کہانیاں ایک سو تیرہ بھی ہوتیں تو میں وقت نکال کر سبھی پڑھ لیتا۔

خواتین و حضرات! میں نے اُن کی کہانی 'پہلی کہانی' جو اُن کی اپنی کہانی ہے، سے پڑھنا شروع کیا تو اُن کی آخری کہانی تک آتے آتے میں اُن کے بے تکان بیانیے کا قائل ہو چکا تھا۔ اُن کی کہانیاں پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ یہ گویا سٹیج پر کھیلی جا رہی ہیں اور ان مختلف تمثیلوں کے لانگ پلے اور شارٹ پلے کے سکرپٹ انھوں نے بڑی صفائی اور فطری بے ساختگی سے تحریر کیے ہیں، مثلاً ''لیلیٰ'' ایک حُزنیہ افسانے کا آغاز سپر سٹار کی تدفین اور تدفین میں شریک لوگوں......یعنی تماشائیوں کے قبرستان سے اپنے گھر لوٹنے سے ہوتا ہے۔

تکنیک کے اعتبار سے یہ بہترین آغاز ہے۔ اُن کی تمام کہانیوں کو اگر پینٹنگز تصور کر لیا جائے تو دیکھنے والے سمجھ جائیں گے کہ یہ کس طرح تکمیل کو پہنچیں، کس طرح سادہ کینوس پر مشاقی کے ساتھ برش چلاتے ہوئے فنِ تصور سازی کے ایک طویل اور پیچیدہ عمل سے گزریں۔

کہانی کار صباحت مشتاق نے بڑی چابکدستی اور دردمندی سے اپنی کہانیوں کے پلاٹ ترتیب دیئے ہیں۔ کہانیوں کا بیانیہ قاری کا ہاتھ تھام کر اُسے اپنی رو میں بہا کر لے جاتا ہے کہ پڑھنے والے کو مہلت ہی نہیں ملتی۔ وہ بڑی خوبصورتی سے کہانی بنتی اور قاری پر اُس کی ایک ایک پرت کھولتی ہیں۔ وہ اپنے کرداروں کو بے رتبہ اور برہنہ نہیں ہونے دیتیں مثلاً اُن کا کردار

ماریہ، یاسمین اور درشت کی محبت میں مبتلا نوجوان لڑکی۔ اپنی کہانیوں میں وہ اپنے کرداروں کی اسیر نظر آتی ہیں جیسا کہ کہانی ''لیلیٰ'' کا سپورٹنگ کردار جو وہ خود ہیں۔ مجھے اُن کی کہانیوں میں بے شمار لڑکھڑاتے ہوئے حوصلہ مند کردار دکھائی دیے۔

صباحت مشتاق جیتی رہو! میں دعا کرتا ہوں کہ تم ان جیسی اور بہت سی کہانیاں اتنی ہی دردمندی سے لکھتی رہو۔ مجھے یقین ہے کہ کہانی کاروں کی آنے والی نسل میں اگر ایسا لکھنے والے دس افراد بھی برسرِکار ہو جائیں تو اردو افسانہ انڈو پاک کی تمام بڑی زبانوں یعنی مراٹھی، ہندی، گجراتی وغیرہ کے ساتھ شانہ بشانہ ملا کر کھڑا ہو سکتا ہے، مجھے یقین ہے اور میں دعا گو ہوں۔

اسد محمد خان

12 مارچ، 2014

کراچی

تعارف

مجھے توصیفی مضامین لکھنے نہیں آتے اور جب کسی کتاب کا پیش لفظ تحریر کرنے کی مجھ سے فرمائش کی جاتی ہے تو میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو جاتی ہوں۔ محض تکلف، مروت یا ہمت افزائی کی خاطر بے جا تعریف توصیف نئے لکھنے والے کے لئے نقصان دہ ثابت سکتی ہے۔ اس قسم کی کئی مثالیں ہمارے یہاں موجود ہیں جب باقاعدہ ایک گروہ کی صورت میں ایک ادبی گروپ گویا اپنے اکھاڑے کے ایک پہلوان کے لئے ڈنکا بجاتا تھا اور دوسرا گروپ اس کے مقابلے میں دوسرا پہلوان کھڑا کرتا تھا۔ فرداً فرداً ادیبوں کے بارے میں باقاعدہ پبلسٹی کی گئی لیکن اصل چیز یہ ہے کہ اس تمام دھوم دھڑاکے کے باوجود وہی ادب زندہ رہا جس میں خوبی موجود تھی۔

یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ عورتوں نے جب لکھنا شروع کیا، اٹھارویں صدی سے یورپ اور انگلستان میں' اور اس کے بعد اواخر بیسویں صدی میں خود ہمارے یہاں اردو میں' تو خواتین محض موضوع سخن نہ رہیں بلکہ ان میں یہ جسارت آ گئی کہ وہ یہ بتا سکیں کہ یہ زندگی اور دنیا کے بارے میں ان کی رائے کیا ہے۔ ہمارے یہاں عورتوں کی اس پیش رفت کو بھی بڑے شک وشبہ یا استہزا کی نظر سے دیکھا گیا۔ شروع شروع میں ایک عرصہ تک یہ کہا گیا کہ ارے صاحب! فلاں فلاں خود تھوڑے ہی لکھتی ہیں' ان کے والد یا شوہر یا بھائی ان کو لکھ کر دیتے ہیں۔ چلئے! عورتوں نے یہ مرحلہ بھی طے کیا کہ خود ان کی ادبی حیثیت کو بھی قبول کر لیا گیا۔

سماجی رویے بدلتے دیر نہیں لگتی۔ خود میری والدہ نے جب لکھنا شروع کیا اور زنانہ رسالوں کی حد بندی کو توڑ کر ایک دم ان کے مضامین اور افسانے ''مخزن'' میں شائع ہونے لگے تو

ان کے لئے یہ افواہ پھیلی کہ وہ کلب میں جا کر گوروں کے ساتھ ڈانس کرتی ہیں' مگر بہت جلد ہی اردو دنیا نے ان کو بحیثیت ایک مضمون نگار' مرد لکھنے والوں کی صف اول میں جگہ دے دی۔

اسی طرح والدہ مرحومہ کی پھوپھی اکبری بیگم جن کا معرکتہ الآراء ناول ''گودڑ کا لال'' 1907ء میں چھپا۔ اس سے قبل ''گلدستہ وفا'' انہوں نے مردانہ فرضی نام عباس مرتضٰی کی حیثیت سے چھپوایا تھا۔ 1907ء تک آ کے تعصبات کچھ کم ہوئے لیکن پھر بھی وہ اپنے بیٹے کی والدہ کی حیثیت سے ہی لکھتی رہیں۔ اپنا نام کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور ''گودڑ کا لال'' بھی اردو کے مین اسٹریم فکشن میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان کی بھتیجی بنت نذرالباقر نے محض اپنے زور بیان اور ادبی صلاحیت کی بناء پر تعصبات کی اس سرحد کو بھی بہت جلد پار کر لیا اور ان کے مضامین و افسانے مردانہ رسالوں میں بھی شائع ہونے لگے۔

ان کا افسانہ ''ایک مکالمہ'' اپنی نوعیت کی یہ پہلی ادبی تخلیق تھی جس میں محض مکالمے کی تکنیک استعمال کی گئی تھی اور یہ ۱۹۰۷ء میں رسالہ ''خاتون'' علی گڑھ میں شائع ہوا تھا۔ شاید ہمارے سماج کے پردہ سسٹم کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کے لکھے ہوئے ادب کو الگ الگ خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ اور بہت جلد یعنی آج سے تقریباً نوّے سال قبل اردو کی ان Pioneer خواتین نے جن میں محمدی بیگم' بنت نذرالباقر اور صغریٰ ہمایوں مرزا شامل تھیں ان حد بندیوں کو توڑا۔ اس کے باوجود عورت کے لکھے ہوئے ادب کے بارے میں تحفظات کہیں کہیں موجود رہے۔ عام طور پر یہ کہا گیا کہ ان کا فکشن ادنیٰ درجے کا ادب ہے۔ یہ رائے ہمارے محترم نقاد پروفیسر وقار عظیم کی بھی تھی۔

لیکن تعجب ہوتا ہے کہ اگر آپ محض ایک زنانہ ماہنامہ ''زیب النساء'' کے پرانے فائل اٹھا کر دیکھئے کہ خواتین کی کتنی بڑی تعداد نے کتنے اچھے افسانے لکھے۔ بے شک وہ افسانے مجموعی طور پر رومانٹک کہلائے جا سکتے ہیں لیکن ان میں انسانی نفسیات' زندگی کے چیدہ معاملات کے متعلق ان خواتین نے کیسی روانی اور فطری بیانیہ انداز میں کتنی اچھی کہانیاں لکھیں۔ گو یہ افسانہ نگار خواتین زیادہ تر بھلا دی گئیں۔

حجاب امتیاز علی منفرد ہیں۔ ان کا اسلوب اور بس دنیا کی انہوں نے تخلیق کی وہ ایسی انوکھی اور دل آویز تھی کہ اس کی کوئی تقلید نہ کر سکا۔ گو ترقی پسندوں نے ان کا مذاق اڑانا اپنا فرض

جانا۔عصمت چغتائی پہلی خاتون تھیں جو اپنی مغلیہ ترک تازی کے ساتھ ادب کے قلعہ پر حملہ آور ہوئیں اور اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ان کے بعد دوسری عصمت چغتائی کا سامنے آنا ذرا مشکل تھا کیوں کہ عصمت آپا نے ادب میں ایک تاریخی رول ادا کیا۔عصمت آپا کے پہلے مجموعہ ''کلیاں'' کی اشاعت کے بعد سے اب تک ادب کی دنیا میں بہت انقلاب آئے۔خارجیت سے داخلیت کی جانب جانے کا سلسلہ رہا۔ہاجرہ، خدیجہ ،بانو قدسیہ اور خالدہ حسین پاکستان کے چند بڑے نام ہیں۔بہت سی خواتین ڈائجسٹوں کی کمرشل تحریروں کی طرف چلی گئی ہیں اور اس میدان میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت کامیاب رہی ہیں۔ہندوستان میں جیلانی بانو کا ادبی مقام تو مسلم ہے۔واجدہ تبسم کمرشل رائٹر بن گئیں۔رفیعہ منظور الامین نے ایک اچھا ناولٹ لکھا۔نئی لکھنے والیوں میں ذکیہ مشہدی اور شمیم صادقہ قابل ذکر ہیں۔مقبول فکشن رائٹرز کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ایک مرتبہ میں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پانچ سو پروفیسروں اور طلبا کی reading habits کا ایک سروے کرایا تھا جس میں زیادہ تر پروفیسروں اور طلبا نے اپنی پسندیدہ مصنفہ رضیہ بٹ کو بتایا۔لہٰذا قبول عام بھی ادبی مرتبے کی سند نہیں ہے۔

اب بالکل آج کی نسل پر آئیے۔میرے ہاتھ میں چند کہانیاں نئی لکھنے والی صباحت مشتاق کی ہیں۔ان کو کس خانے میں رکھا جائے؟ یہاں پر مجھے ایک بات یاد آئی۔۱۹۸۸ء میں جب میں لاہور گئی تو حجاب امتیاز علی نے مجھے بلایا۔وہ میری والدہ کی بہت پرانی دوست تھیں اور ان کی شادی بھی امتیاز علی تاج سے میرے والد مرحوم نے کرائی تھی۔اس سے قبل امتیاز علی تاج کے والد شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی نے جو میری والدہ کے منہ بولے بھائی تھے۔ان کی شادی یلدرام سے کرائی تھی۔چنانچہ قصہ کوتاہ حجاب امتیاز علی سے ایک عرصے کے بعد لاہور میں ملی تو ان کو ماشاءاللہ نہایت بشاش پایا۔تب انہوں نے اپنے یہاں دعوت میں ایک ٹی وی کے گائیک کو بلایا تھا۔مجھ سے کہنے لگی میوزک دو طرح کی ہوتی ہے۔اچھی میوزک اور بری۔یہ اچھی میوزک والے ہیں۔تو آمدم برسر مطلب اس طرح قدیم و جدید نئی نسل اور پرانی نسل، ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، بیانیہ، تجریدی اور علامتی قضیوں سے قطع نظر ادب محض دو طرح کا ہوتا ہے۔اچھا ادب اور برا۔تو صباحت مشتاق کے افسانوں کو میں سمجھتی ہوں کہ اچھے ادب کے خانے میں رکھا جائے گا۔نئے لکھنے والوں کے ہجوم میں شناخت قائم کرنا آسان نہیں ہے لیکن صباحت بڑی آسانی کے ساتھ اپنا راستہ بنا چکی

ہے۔ان کے افسانوں میں مجھ کو ایک اہم وصف یہ نظر آیا کہ ان میں آورد نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس خیال سے لکھے گئے ہیں کہ کسی انوکھی تکنیک کا مظاہرہ کیا جائے۔ مصنفہ کی ذہنی پختگی اور اسلوب پر ان کی گرفت بہت واضح ہے۔ موضوعات کا تنوع بھی قابل ذکر ہے۔ان کے مجموعے کا پہلا افسانہ ''ماریہ'' دور حاضر میں لکھے گئے چند بہت اچھے افسانوں میں با آسانی شامل کیا جا سکتا ہے۔اس افسانے کی ایک خوبی یہ ہے کہ یہ دنیا کے کسی بھی معاشرے کی کہانی ہوسکتی ہے۔''ماریہ'' ایک چینی کیتھولک لڑکی بھی ہوسکتی ہے، وہ ممبئی کی گوانی لڑکی بھی ہوسکتی ہے اور لاہور، مری یا کینیڈا کی بھی ہو سکتی ہے ۔ یہ ایک یونیورسل افسانہ ہے۔ جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے صباحت مشتاق جذباتیت سے صاف بچ جاتی ہیں۔ غیر ضروری الفاظ اور فالتو تفصیلات کو ان کے افسانوں میں جگہ نہیں ملتی۔ان کے بعض جملے اچانک چونکا دیتے ہیں۔ مثلاً یہ تعارفی جملہ کہ ''میں وہ بن مانس ہوں جو خلائی سفر پر بھیجا گیا تھا۔'' ''ماریا'' اور ''اعتراف'' جدید اور مغربی انداز کی غیر معمولی کہانیاں ہیں۔اسی طرح ''آسیب'' بھی ایک غیر معمولی داستان ہے۔''برف'' بھی بہت اچھی اور متاثر کرتی ہے۔ میں صباحت مشتاق کو ایک مشورہ دینا چاہتی ہوں۔اس کی بعض کہانیاں ضرورت سے زیادہ مختصر ہیں۔وہ ایسی منی ایچر تصویریں بنانے کی بجائے کینوس کو ذرا وسیع بھی کرسکتی ہیں۔ بہر حال ابھی تو اکیسویں صدی ان کی منتظر ہے اور اس کے آغاز میں اردو افسانے کی عمر کے سو سال بھی پورے ہو جائیں گے۔ افسانے کے آنے والے اس عہد میں مجھے یقین ہے کہ صباحت ادب میں ایک اہم مقام حاصل کرلیں گی۔

قرۃ العین حیدر

23 مئی 1997ء

نوئیڈا، یو۔پی

پہلی کہانی

مجھے یاد ہے جب میں اپنے پہلے افسانوی مجموعے 'سات کہانیاں' کا انتخاب لے کر ابا کو دکھانے باغیچے میں گئی تو وہ بوگن بیلیا کے نیچے سٹینڈ پر رکھے لنکن کے پلاسٹر ہیڈ کے پاس میز بچھائے شطرنج پر جھکے ہوئے تھے۔ ساتھ کیپسٹن کی ڈبیہ، ماچس اور ایش ٹرے۔ دائیں طرف کی خالی کرسی لنکن کے روبرو تھی۔ انھیں اپنے مصور دوست انکل زوار کا انتظار تھا۔ جب وہ اس کرسی پر بیٹھ کر ابا کے ساتھ شطرنج کھیلتے تو یوں لگتا تینوں کھیل رہے ہیں۔

ابو جی! کیا ابراہم لنکن کو بھی شطرنج کا شوق تھا؟ میں نے انکل زوار کی کرسی پر بیٹھ کر پوچھا۔

جی ہاں انہوں نے کہا۔ لنکن کو تو شطرنج کا اس قدر شوق تھا کہ وہ ناشتہ لنچ اور ڈنر سب بھول کر دوستوں کے ساتھ صبح سے رات گئے تک شطرنج کی بازیاں لگاتا رہتا۔

میں نے ہنکارا بھرا تو وہ بولے

شطرنج کھیل ہی ایسا ہے میرے بچے۔ کھیل کیا' جنگ سمجھو جنگ۔ مکمل بیٹل فیلڈ۔ پیادے' گھوڑے' ہاتھی' بادشاہ' وزیر سب جان توڑ کر لڑتے ہیں۔

''سوائے بادشاہ کے'' میں نے بات کاٹی۔ ابا نے شاہ سے زیادہ شاہ کے طرف دار ہو کر کہا

بی بی۔ بادشاہ تو کمانڈر ہوتا ہے۔ صرف گائیڈ کرتا ہے۔

مگر شطرنج میں تو وہ گائیڈ بھی نہیں کرتا۔ ادھر ادھر چھپتا پھرتا ہے۔ میں نے سچی بات کہہ دی

یہ ادھر ادھر چھپنا بھی وار سٹرٹیجی ہے۔ انھوں نے مزید روشنی ڈالی۔ بہرحال جب تک ہار جیت کا فیصلہ نہ

ہو جائے کھیل ختم کرنا بزدلی ہے۔ چاہے لنکن کی طرح بیوی سر پر چائے کی ٹرے الٹ دے۔

وہ کیسے؟ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

وہ ایسے کہ ایک دن دنیا و مافیہا سے بے خبر کسی دوست کے ساتھ سر جوڑے کئی گھنٹوں سے شطرنج میں مصروف تھے۔ بیوی نے کئی بار چائے رکھی اور ہر بار ٹھنڈی ہونے پر واپس لے جاتی۔ شطرنج کھیلنے والا دوست بھی غالباً انھیں ناپسند تھا اس لئے پیمانہ صبر ذرا جلدی لبریز ہو گیا۔ گرم گرم چائے کی ٹرے لے کر پاس کھڑی ہو گئیں۔ جب کھلاڑیوں نے کوئی نوٹس نہ لیا تو انھوں نے ٹرے کو عین بساط کے اوپر لا کر ہاتھ چھوڑ دیے۔ ابا نے دونوں ہاتھ بلند کر کے فرضی ٹرے کو چھوڑا۔

مسز لنکن پیر پٹختی کچن کی طرف روانہ ہو گئیں اور دونوں دوست کپڑے جھاڑتے کھڑے ہو گئے۔ لنکن نے معذرت کی۔ ہاتھ ملایا اور کہا ''کل اسی چال سے دوبارہ گیم شروع ہو گی۔ گڈ نائٹ۔

ابا نے کرسی سے ٹیک لگا کر سگریٹ سلگایا۔ اس دوران میں لنکن اور اس کے دوست سے ہونے والے سلوک کے حوالے سے انکل زوار کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ بہت اچھے تھے اور امی انھیں ناپسند بھی نہیں کرتی تھیں۔ شطرنج کی بازی البتہ لمبی لگاتے تھے۔ جو میرا خیال ہے سبھی لگاتے ہوں گے۔

اچھا ابو ایسا کبھی آپ اور انکل کے ساتھ امی کر دیں تو؟ اگرچہ اس کا امکان قطعی نہیں ہے۔

یہ قطعی والی بات میں نہیں مانتا۔ شطرنج کھیلنے والے شوہروں کی بیویاں اس بارے ایک سا رویہ رکھتی ہیں۔ اور پھر تمہاری ماں اور مسز لنکن میں تو کئی باتیں ویسے بھی مشترکہ ہیں۔

وہ کون سی؟ میں نے پوچھا

ابا بولے ایک تو بلڈ پریشر سمجھو دوسرے۔۔۔

ابو جانے دیں'' میں نے بات کاٹی۔ آپ یہ دل سے جوڑ کر کہہ رہے ہیں۔ اس زمانے میں تو بلڈ پریشر دریافت ہی نہیں ہوا تھا۔

چلو دریافت نہیں ہوا تھا مگر ہوتا تو تھا۔ ابا ڈٹ گئے۔ انسان کا رویہ بتا دیتا ہے کہ اسے

بلڈ پریشر ہے کہ نہیں۔ اچھا آگے سنو مسز لنکن کا باپ پوسٹ ماسٹر تھا اور تمہارا نانا بھی پوسٹ ماسٹر تھا۔ دونوں کے گھرانے شوہروں کی نسبت زیادہ خوشحال تھے۔ لنکن نے بھی زندگی گر اس روٹ سے شروع کی اور وکیل بنا۔ تقریباً اسی طرح میں بھی وکیل بنا۔ اسے بھی شطرنج کا شوق اور مجھے بھی۔ زوار بھی مصور ہے اور ریسرچ کے مطابق لنکن کے دوست کو بھی مصوری سے دلچسپی تھی......

کس کی ریسرچ۔ ابا آپ پھر دل سے جوڑ رہے ہیں۔ میں نے مؤدبانہ کہا۔

ڈیل کارنیگی کی ریسرچ۔۔۔اس کی کتاب پڑھو۔۔۔گمنام لنکن۔

ابا کی لائبریری میں وہ کتاب میری نظر سے گزر چکی تھی اس لئے کہا اس میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں۔

ہوسکتا ہے ہیرو ورشپ کے تحت یہ بات اس ایڈیشن سے نکال دی گئی ہو۔ ابا نے دونوں خواتین کے تقابلی جائزے کے بعد کہا

اب بتاؤ اتنی مشترک باتوں کے بعد کیا اس گھر میں کسی دن ٹرے الٹنے کا واقعہ نہیں ہو سکتا۔'' ابا نے یہ بات اتنے خوفزدہ لہجے میں کہی گویا ٹرے نہیں ٹرین الٹنے کا واقعہ ہو۔ میری گود میں کہانیوں کا مسودہ دیکھ کر پوچھا'' یہ کیا ہے؟

میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ فائل ان کے سامنے رکھی اور پہلا ورق الٹ کر دکھایا۔

انھوں نے ابرو اٹھا کر عینک سے اوپر جھانکا'' مجھے پتہ تھا کہ ایک دن تم اپنی گپ بازیاں جمع کرو گی۔ تم شروع ہی سے کہانی گھڑنا جانتی ہو۔ بچپن ہی سے''

گویا ہونہار بروا، میں نے خودستائی کی۔

کچھ اتنی بھی زیادہ ہونہار نہیں۔ بس تمہیں خودنمائی اور منفرد نظر آنے کا خبط تھا۔ باتونی بہت تھیں۔ اپنے سے چھوٹے اور قدرے احمق بچوں کا مجمع لگا کر کبھی ماں سے سنی ہوئی کہانی اور کبھی فرضی داستان انھیں سنا کر متاثر کرنے کا شوق تھا۔ ایسے میں سرکنڈے کی ایک چھڑی تم اپنے ہاتھ میں پکڑے رہتیں اور کہانی کے ڈرامائی اثرات چھڑی ہلا کر بیان کرتیں۔

ابا سامنے رکھے مسودے کے ورق الٹتے الٹتے مجھے بتا رہے تھے۔ میری تعریف ہو رہی تھی، اس لئے اشتیاق بڑھا اور پوچھا۔

اچھا ابو میرے بارے میں کچھ اور بتائیں۔ یہ بتائیں کہ میں بچپن میں کیسی تھی؟

پہلے چائے پلاؤ پھر بتائیں گے۔ انھوں نے شرط رکھی۔

ہوگئی چائے میں نے چھوٹی بہن کو چائے کے لئے آواز دی (روز کی طرح)

آؤ۔ بتاتے ہیں۔ ابا اٹھے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے۔ وہ بیڈ روم سے ملحقہ راہداری نما اپنے کمرے میں آ کر اس دیوار کے سامنے کھڑے ہو گئے جس پر بہت سی خاندانی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف کتابوں کے ریک۔ دوسری طرف آرام دہ کشن اور تکیے۔ برابر میں فرشی بستر پر جہاں سے لیٹے لیٹے ساری تصویریں بخوبی دیکھی جاسکتی تھیں۔

کچھ دیر تصویروں کا جائزہ لے کر انھوں نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا تم ایسی تھیں۔

یہ تصویر ہم دو بہنوں کی تھی۔ میں تین سال کی اور چھوٹی دو سال۔ پنک فراک پاجامے اور بے بی جوتے پہنے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ہم فوٹو سٹوڈیو کے بنچ پر کھڑی تھیں (یہاں کھڑا ہونا کیمرے کے لیول تک پہنچنے کے لئے ضروری تھا۔ اس میں شرم کی کوئی بات نہیں کیونکہ اس وقت ہم دونوں بہت چھوٹی تھیں۔)

جی میں دیکھ رہی ہوں۔ ایسی ہی تھی۔ مگر آپ مجھے یہ بتائیں کے میری عادات کیسی تھیں۔ کچھ مثالیں۔ کوئی اہم واقعات؟

محترمہ صباحت مشتاق صاحبہ! ابو نے مسودے کے حوالے سے میرا نام لیا۔ اس تصویر میں جتنی تم نظر آ رہی ہو اس کے مطابق کوئی اہم واقعہ تم سے منسوب ہونا انتہائی قبل از وقت لگتا ہے۔ اس زمانے کے اہم واقعات تم سے عمر اور سائز میں بڑے لوگوں کے بارے میں ضرور ہوں گے۔ تمہارے بارے مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا۔

چلیے اس طرح کریں'' میں نے تجویز دی۔ '' میری کوئی ایسی بات جس پر آپ کو بہت

ہنسی آئی ہو یا غصہ وغیرہ آیا ہو۔ جیسے عام طور پر بچوں کے سلسلے میں ہوتا ہے۔

ابا ایک کشن پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد کہا

سنو! تمہاری ایک بات مجھے یاد آ رہی ہے۔ پہلی بار تم نے کہی تو ہنسی آئی مگر کچھ دنوں بعد اسی بات پر تھوڑا غصہ۔ وہ یہ کہ تم ہوگی کوئی ڈیڑھ دو سال کے لگ بھگ۔ اس زمانے میں ہم لوگ ملازمت کے سلسلے میں سرکاری کوارٹرز میں رہتے تھے۔ اجاڑ علاقہ۔ کوارٹرز کے ایک طرف مویشی ہسپتال اور اصطبل۔ دوسری جانب تحصیل حوالات۔ سامنے کھیت اور ایک کنواں۔ ہوائی چپل نئی نئی چلی تھی۔ ہم نے ایک منا سا جوڑا لا کر تمہیں پہنایا تو چلتے میں وہ دوبارہ پاؤں سے پھسل کر نکل جاتا تھا اور اسے ہاتھ میں لے کر دھول مٹی میں ننگے پاؤں چلتی تھیں۔ کئی بار پاؤں دھلا کر پہنایا مگر پھر وہی حرکت۔ ایک بار نہا کر چپل پہنے تم باہر نکلیں تو میں نے کہا دیکھو اب کے چپل اتار کر ہاتھ میں لی تو پٹائی کروں گا۔ کافی دیر بعد جب تم واپس آئیں اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں باہر نکلا دیکھا کہ پاؤں اٹے چپل ہاتھ میں لئے تم کھڑی ہو۔ یہ منظر دیکھ کر میرے تیوروں کا اندازہ تمہیں ہوگیا تو تم نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔

''ابو جی میری پٹائی نہ کرنا'' تم سر اٹھائے میرے چہرے کو دیکھ رہی تھیں۔ تمہاری یہ بات سن کر میری ہنسی چھوٹ گئی اور میں تمہیں گود میں اٹھا کر اندر لے آیا۔

اور غصہ کب آیا؟ میں نے پوچھا۔

وہ اس طرح، ابا بتانے لگے کہ ہم تمہاری اماں کے ساتھ فلم دیکھنے گئے۔ قصبے کا اوپن ایئر سینما جس کے بکنگ آفس کی چھت پر گویا گیلری کلاس تھی۔ ہم تمہیں گود میں لئے بیٹھے تھے۔ اور تم فلم کے مختلف مناظر پر تبصرہ کرنے لگیں۔ جب لڑائی مار کٹائی آئی تو تم نے اس منظر کو حقیقی سمجھ کر ہیرو اور ولن کے ساتھیوں سے اچانک کہا ''او بھئی نہ لڑو۔ چوٹ لگ جائے گی۔'' جب ہیروئن ناچتے ہوئے گاتی تو تم تالی بجانے لگتیں۔ ایک منظر میں ہیرو کے مسخرے ساتھی نے انڈہ چھیل کر منہ میں ڈالا تو تم نے اچانک تالی بجا کر کہا ''او دیکھو۔ فل انڈہ ہی کھا گیا۔'' میں نے اس خیال سے

کہ ساتھ بیٹھے لوگ ڈسٹرب ہو رہے ہوں گے تمہارے کان میں کہا چپ ہو کر بیٹھو۔ تم بڑی فرمانبرداری سے میری ٹھوڑی کے نیچے سر دے کر خاموشی سے فلم دیکھنے لگیں۔''

مگر یہاں غصے والی سچو ایشن تو کہیں نظر نہیں آتی۔ میں نے ابا سے کہا۔

وہ بھی آرہی ہے۔ تسلی رکھو۔ جب تم بظاہر چپ چاپ میری گود میں بیٹھی فلم دیکھ رہی تھیں، اچانک مجھے پتہ چلا کہ میری پتلون گھٹنوں سے کر پائنچوں تک بھیگ چکی تھی۔ پھر جوتے بھی چپچپانے لگے۔ میری کسمساہٹ بھانپ کر تم نے میری ٹھوڑی سے سر نکال کر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا اور تاکید کی ''ابو۔ میری پٹائی نہ کرنا۔'' (اگرچہ حرکت سو فیصد پٹائی کی تھی)

مجھے ہنسی آگئی۔ ابا سے پوچھا اس زمانے کی تصویر ان میں سے کون سی ہے؟ ''وہ دیکھو'' ابا بولے۔ تم دادا جان کی گود میں بیٹھی ہو۔ چھوٹی کو گود میں اٹھائے دادی کے پیچھے میں کھڑا ہوں۔ تمہارے ہاتھ میں جو شاپنگ ٹوکری ہے وہ تم نے بطور پرس اٹھا رکھی ہے۔ یہ آئیڈیا شاید تمہیں ماں کی تصویر دیکھ کر آیا ہوگا جس میں وہ دلہن بنی پرس لئے بیٹھی ہے۔ اس زمانے میں خواتین کے ہاتھ میں پرس رکھنا ایک طرح کا فیشن تھا۔ خاص کر تصویر بنواتے وقت۔ تم خاصی ہوشیار تھی اور چھوٹی کے مقابلے میں خود کو برتر ثابت کرنے پر تلی رہتیں۔ کچہری سے واپسی پر میں جوتے اتارتا تو تم دونوں جرابیں اتارنے کے لئے لپکتیں۔ اگر چھوٹی جراب نہ کھینچ سکتی تو تم چھین کر خود اتارتیں اور کہتیں ''تم میں تو زور ہی نہیں۔''

ایک دن وہ جراب کھینچتے پیچھے گر پڑی تو تم نے اس کا مذاق اڑایا۔ دوبارہ وہ جراب اتارنے لگی تو تم نے طنز سے کہا ''رہنے دو گر پڑو گی'' اس شکست پر وہ ہمیشہ ماں کی گود میں جا بیٹھتی۔ میں سگریٹ پیتا تو تم دور سے اعلان کرتی بھاگتیں۔

''میں پلاؤں گی'' پھر تم سگریٹ نکال کر میرے منہ میں رکھتیں اور دو چار تیلیاں ضائع کر کے سلگا دیتیں۔ ایک دن چھوٹی پہلے بھاگ کر آگئی۔ سگریٹ تو منہ میں لگا دیا لیکن وہ ماچس جلانے سے ڈرتی تھی۔ تم نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور کہا ''جلاؤ ماچس'' اس نے شکست مان

کر ماچس تمہیں دے دی۔

اچھا اور کوئی ایسی ہی بات؟ میں نے فخر سے پوچھا۔

اور بات ریڈیو لگانے کی ہے۔ بڑا اچھا ریڈیو تھا مرفی۔ ان دنوں میں ریڈیو سیلون پر ''بنا کا گیت مالا'' بہت سنتا تھا اور میرے کہنے پر کہ بنا کا گیت مالا لگاؤ تم اپنے قد کے برابر ٹیبل رکھے مرفی کی سوئی ٹھیک طرح لگا دیتیں۔ مقابلے کی دوڑ میں چھوٹی نے بھی کئی بار بنا کا لگانے کی کوشش کی۔ وہ ایڑیاں اٹھا کر ناب کو ادھر ادھر گھماتی رہتی کہ کہیں تو بنا کا لگ ہی جائے گا۔ ناب گھماتے ہوئے وہ بجائے ڈائل کو دیکھنے کے مسلسل مڑ کر ہمیں دیکھتی رہتی کہ ٹھیک لگا رہی ہوں نا۔ تم اس کی نادانی پر ہنستی رہتیں اور آخر خود جا کر سوئی ٹھیک سے لگا تیں۔ اس شکست پر وہ ماں کی گود میں جا بیٹھتی۔

پھر ابا نے ایک اور واقعہ سنایا

یہ بھی اس سرکاری کوارٹر کا ذکر ہے۔ میں بچوں کے لئے روسی کہانیوں کی کتابیں لایا جسے تمہاری ماں پڑھ کر سنایا کرتی تھی۔ تم یہ کہانیاں آئندہ آس پاس کے بچوں کو مویشی ہسپتال کی دیوار کے ساتھ لگے اینٹوں کے ڈھیر پر قدرے اونچی جگہ بیٹھ کر سنایا کرتیں۔ سامعین ایک ایک اینٹ کی نشست سنبھالتے اور تم سرکنڈے کی چھڑی لے کر ماں کے انداز میں وہ کہانیاں انھیں سنا دیتیں۔ اس طرح تمہاری ایک طرح کی انفرادیت قائم ہوگئی جس سے چھوٹی نے سبکی محسوس کی۔ ایک دن تمہاری ماں چارپائی پر لیٹی تمہیں کوئی کہانی سنا رہی تھی کہ چھوٹی روسی کہانیوں کی کتاب لے کر آ گئی۔ کتاب ماں کو دے کر چارپائی پر چڑھنا چاہا مگر ناکام ہوئی۔ کچن سے چوکی اٹھا کر پاؤں کے نیچے رکھی اور ٹیڈی بیئر کی طرح پھلانگ کر ماں کے پیٹ پر بیٹھ گئی کیونکہ وہ تمہاری نشست سے اونچا تھا۔ پھر ماں سے کہا مجھے کہانی سناؤ۔ ماں کہانی پڑھنے لگی۔ تم نے ہنکارا بھرنا شروع کر دیا۔ یہ ہنکارا اسے مداخلت لگا کیونکہ کتاب وہ لائی اور کہانی کی فرمائش بھی اس کی تھی۔ جب تمہارا ہنکارا بھرنا بند نہ ہوا تو اس نے ماں کے ہاتھ سے کتاب چھین کر کہا ساری کہانی تو یہ سنے جا رہی ہے

ماں ہنس پڑی اور کہا تمہارے کان بند ہیں، سن تو تم بھی رہی ہو۔

''مگر یہ کیوں سن رہی ہے؟'' چھوٹی نے احتجاج جاری رکھا۔ اسے یہ بھی غصہ تھا کہ یہ کہانی وہ باہر جا کر دوسروں کو سنائے گی اور نمبر بنائے گی۔

جب ابا یہ واقعہ سنا رہے تھے، چھوٹی چائے بناتے یہ سب سن رہی تھی۔ ٹرے ہاتھ میں لئے اندر آئی اور کہا ابا آپ دونوں میری غیبت کر رہے ہیں۔ آپ کی اس ادیب خانم سے میں نے ہمیشہ زیادہ مارکس لئے ہیں۔

ابا بولے ''یہی تو میں اس سے کہہ رہا تھا''

چھوٹی بولی جی نہیں۔ آپ مجھے بچپن کی بلی اور متو کہہ رہے تھے۔ میں سب سن رہی تھی۔

ابا نے اسے پیار سے پاس بٹھالیا اور ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا جس میں ہم تینوں بہنیں فرش پر بیٹھی ہیں۔ ابو امی پیچھے کرسیوں پر۔ ہمارے درمیان میں سب سے چھوٹی منکی کیپ پہنے ہوئے۔

یہ لودھراں کی تصویر ہے۔ میں وہاں سرکاری وکیل تھا۔ تم دونوں کو پہلی بار وہیں سکول میں داخل کرایا۔ ایک روز گھر واپسی پر تم دونوں باہر گیٹ پر ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں اور اندر نہیں آ رہی تھیں۔ اپنے سکول بیگ ڈیوڑھی کے صدر دروازے پر رکھے دیوار سے لگی ایک کہہ رہی تھی تم اٹھاؤ دوسری کہتی نہیں تم اٹھاؤ۔ تمہاری منکی کیپ والی ننھی بہن نے اس واقعہ کی اطلاع ماں کو دی تو وہ دروازے پر آئی۔ پوچھا اندر کیوں نہیں آتیں تو تم ایک دوسری کو گھورتی دیوار سے چپک گئیں۔ ماں نے سکول بیگ اٹھائے تو وہ ایک دم بھاری ہو گئے۔ کھول کر دیکھے تو ایک بیگ میں سکول کی دو کلو وزنی پیتل کی گھنٹی نکلی اور دوسری کے بیگ میں گھنٹی بجانے والا لوہے کا گرز۔ اب پوچھنے پر نہ تم بتا رہی ہو کہ کہاں سے آئے اور نہ دوسری منہ کھول رہی تھی۔ ماں کے بیان کے مطابق وہ تم دونوں کو گلی سے گھسیٹ کر اندر لائی اور قطار میں کھڑے کر کے ابو کو بتانے کی دھمکی دیکر بات اگلوانے کی کوشش کی۔ تب چھوٹی نے ڈر کے مارے بتا دیا کہ سکول ختم ہونے پر چپڑاسی نے جب

گھنٹی سٹینڈ سے اتار کر مِس کے کمرے میں رکھی اور چلا گیا تو تم نے گھنٹی اپنے بیگ میں اور گرز چھوٹی کے بیگ میں رکھ دیا کہ لے چلو گھر میں بجایا کریں گے۔ تم سے پوچھا تو تم گھنٹی چرانے سے صاف مکر گئیں اور کہا آج مِس نے سب بچوں میں ایک ایک گھنٹی بانٹی ہے اور یہ میرے حصے میں آئی تھی۔ مزید یقین دہانی یہ بھی کرائی کہ چاہے مِس سے پوچھ لو۔

چھوٹی اب چہک رہی تھی کیوں کہ الزام کی زد پر میں تھی۔ اس کی چمک کم کرنے کے لئے میں نے کہا "پھر مِس سے پوچھا کیوں نہیں۔ میں تو آج بھی یہی کہتی ہوں کے مِس نے سب بچوں میں گھنٹیاں بانٹی تھیں۔"

"اللہ! آج بھی وہی جھوٹ" چھوٹی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"جی جناب" میں نے شرارت سے کہا۔ وہ کیا ہے کہ

جھوٹ بولا ہے تو قائم بھی رہو اس پر ظفر
آدمی کو صاحب کردار ہونا چاہیے

میرے کردار کی اس مضبوطی پر ایک زبردست قہقہہ لگا۔

چائے ختم ہوئی تو میں نے کہا ابا جب آپ ہم سے خوش ہوتے تھے تو کیا کرتے تھے؟

جب میں تمہیں کہتا تھا کہ او بسنتی سناؤ اور چھوٹی کو آئی بالیت۔ اِدھر میں نے فرمائش کی اور اُدھر تم نے نماز کی نیت جیسے ہاتھ باندھ کر گانے لگتیں۔ او بسنتی پون پاگل نہ جا رے نہ جا" تم ختم کرتیں تو یہ چھوٹی کھڑی ہو جاتی۔ کبھی کبھی دونوں کورس گاتیں

ڈاکٹر ڈاکٹر آئی بالیت
سب کا پیار سب کا میت
دکھیوں کے کام آنے والا
سب کے روگ مٹانے والا

"اور کون کون سے گانے ہم گاتے تھے؟" میں نے ماضی کو کریدا۔

''کئی تھے'' ابا بولے زیادہ تر برمن کے۔ ایک وہ تھا'' او میرے مانجھی اب کی بار۔ لے چل پار۔ فلم بندھی کا۔

دوسرا'' یہاں کون ہے تیرا۔ مسافر۔ جائے گا کہاں''

برمن بنگالی تھے اور مسافر کو موسافر گاتے تھے۔ یہ فلم گائیڈ کا گانا تھا۔

اور وہ ایک دوسرا تھا فلم ''سجاتا'' ہی کا ''سُن میرے بُندھو رے۔ سُن میرے متوا''

میں انہیں اکثر گنگناتا تھا اور تم نے یاد کر لیے۔ پھر میں تم سے بھی یہی سنتا تھا۔ بانیت با جماعت۔

مجھے ابا کی یادداشت پر فخر ہوا۔ وہ اب بچپن کی تصویروں سے ہٹ کر ہمارے یونیورسٹی گروپس دیکھ رہے تھے۔

ہم ابا امی کے پاؤں میں بیٹھے بلیک اینڈ وائٹ تینوں لا روے اور پیو پے کلر گروپ فوٹو میں سٹائکش پوز بنائے کھڑے تھے۔

فرنٹ رو چیئرز۔ ٹانگیں کراس کئے اور گود میں ہاتھ رکھے چیئر مین فیکلٹی اور ٹیچرز

فرنٹ روسٹینڈنگ۔ دائیں سے بائیں۔ نمبر تین صباحت مشتاق

دوسری تصویر پر اسی طرح کرسیوں پر بیٹھے ہیڈ آف ڈیپارمنٹ اور ٹیچرز

فرسٹ روسٹیند نگ۔ دائیں سے بائیں۔ نمبر چار۔ فرحت مشتاق (چھوٹی)

ابا یہ تصویر روز دیکھتے ہیں۔

یہ ان کے فرشی بستر اور بک شیلفوں کے عین سامنے دیوار پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ تصویریں اسی طرح لگی رہیں گی۔

اُس وقت بھی جب ہم ایک ایک کر کے یہاں سے رخصت ہو جائیں گی۔

اور اس وقت بھی جب ان میں سجا ہر چہرہ ماضی میں ڈوب کر صرف ایک ایک نام رہ جائے گا۔

صباحت مشتاق

نہ جنوں رہا نہ پری رہی

صبح کے 10 بج چکے تھے۔ رات بھر کی تیز بارش کے بعد دھوپ تیز اور چمک دار تھی۔ جلیل حسن سلیپنگ گاؤن میں ملبوس ہاتھ میں اخبار لیے کمرے سے باہر نکلے۔ کچن میں جھانک کر دیکھا شفیق کو موجود نہ پا کر وہ برآمدے سے ہوتے ہوئے باہر لان کی طرف چلے آئے۔ شفیق لان میں ایک کیاری کے پاس بیٹھا اُس کی نوک پلک سنوار رہا تھا۔

جلیل حسن برآمدے کی سیڑھیاں اُتر کر لان میں آ کھڑے ہوئے۔ رات کی تیز بارش اور طوفانی ہوا نے نرم و نازک پھولوں اور کونپلوں کو زمین میں بچھا دیا تھا۔ جنھیں شفیق بڑی نرمی اور محبت سے دوبارہ اُٹھنے پر آمادہ کر رہا تھا۔ ٹوٹ جانے والی ٹہنیوں کو اُس نے پہلے ہی کاٹ کر علیحدہ کر لیا تھا۔ برآمدے کے ستونوں پر چڑھی بوگن ویلیا کی بیل تیز ہوا سے گر کر سیڑھیوں پر آ پڑی تھی اور پھول بکھر کر گیلی گھاس سے چپک گئے تھے۔ پورا لان رات گزرنے والے طوفان کی جھلک پیش کر رہا تھا مگر یہاں تو یہ روز کا معمول تھا یہ منظر یہاں کے مکینوں کے لیے نئے نہ تھے اس لیے جلیل حسن یہ سب سرسری نظر سے دیکھتے ہوئے کیاری کی طرف بڑھے۔

آہٹ سن کر شفیق نے کندھے کے اوپر سے سر گھما کر دیکھا، جلیل حسن سلیپنگ گاؤن میں ملبوس ہاتھ میں اخبار لیے اُس کے قریب کھڑے تھے۔

''رات بہت تیز بارش اور ہوا تھی صاحب۔'' شفیق نے جلیل حسن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''طوفان تھا شفیق میاں! بارش اور ہوا کہاں تھی۔''

''آپ چائے لیں گے؟'' شفیق نے پوچھا۔
''ہاں بہت طلب ہو رہی ہے۔'' جلیل حسن نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے کہا، کہ ان کی نظر پھاٹک سے پرے پگ ڈنڈی پر چلتے اُس شخص پر پڑی جو اُسی پھاٹک کی طرف آ رہا تھا کیوں کہ یہ مٹیالی اور باریک سی پگ ڈنڈی اسی کاٹج کی طرف آتی تھی۔
''کون ہے یہ شخص؟''
جلیل حسن نے اُس کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا مگر دور ہونے کے سبب وہ اُسے پہچان نہ پائے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ آنے والا اب چوبی تختوں والا پھاٹک عبور کر کے تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ اُن کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ بالکل اُن کے سامنے آ کھڑا ہوا مگر وہ اب بھی اُسے پہچان نہ پائے۔
''میرا نام تیمور مرزا ہے۔'' آنے والے نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔
''مجھے جلیل حسن کہتے ہیں۔'' نہ پہچاننے کے باوجود اُنھوں نے آنے والے کا ہاتھ گرمجوشی سے تھام لیا اور کرسی کی طرف اشارہ کیا، ''تشریف رکھیے۔''
''شکریہ۔'' تیمور مرزا نے ناہموار سانس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ چند لمحے سانس درست کرنے کے بعد تیمور مرزا بولے۔
''میں صبح سیر کے لیے نکلا تو سوچا آج معمول کے راستوں کی بجائے کسی اور طرف نکلا جائے۔ سو کسی نئے راستے کی تلاش میں آپ کے کاٹج کی طرف آتی اِس پگ ڈنڈی کی طرف آ نکلا، اور میرا یہ تجسس، کہ یہ پگ ڈنڈی کہاں تک جاتی ہے، مجھے اس کاٹج تک لے آیا۔ اگرچہ اب اِس عمر میں اِن راستوں پر چلنا دشوار لگتا ہے۔''
جلیل حسن غور سے اُس اجنبی کو دیکھ رہے تھے جو عمر میں اُن سے کچھ ہی سال بڑا ہوگا۔ سرخ و سپید رنگت، دراز قد اور خوش لباس۔ گرے پینٹ اور بلیو بلیزر کے ساتھ گلے میں سرخ مفلر

بہت بچ رہا تھا۔ نوک دار گھنی مونچھیں اور بال جو زیادہ تر سفید ہو چکے تھے اُس کی وجاہت میں اضافہ کر رہے تھے۔ جلیل حسن متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور مسکرا کر بولے

''جی ہاں! بس یہی ایک خرابی ہے اس گھر میں کہ نئے آنے والوں کو یہ راستہ مشکل لگتا ہے۔''

تیمور مرزا نے نظریں دوڑا کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ لمبے چوڑے لان کے بیچ بیلوں سے ڈھکا ایک کاٹج جس کے اِرد گرد پھولوں کی کیاریاں بڑی خوش نما دکھائی دے رہی تھیں اور ایک کمر خمیدہ شخص اُن کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھا۔

''بہت خوبصورت اور پُر سکون ہے آپ کا گھر۔'' تیمور مرزا نے کہا۔

''شکریہ! مجھے یہ جگہ اِسی لیے پسند ہے کہ آبادی سے دور اور پُرسکون ہے ورنہ اب تو یہ پہاڑی علاقہ شہر سے زیادہ گنجان ہو گیا ہے۔ پُر ہجوم بازاروں اور ٹریفک کے شور نے اِس کی ساری خوبصورتی اور سکون کو ختم کر دیا ہے آپ چائے تو پئیں گے؟''

''ضرور۔''

''بھئی شفیق میاں! ذرا جلدی چائے پلائیں، مہمان بھی آئے ہیں۔'' کیاری میں کام کرتے شخص نے وہیں سے گردن گھما کر دیکھا مگر آنے والے مہمان کا چہرہ شناسا نہ تھا سو وہ وہیں سے کچن کی طرف چل دیا۔

''شفیق پچھلے بیس سال سے میرے ساتھ ہے جب سے میں نے یہ گھر بنایا تب سے۔ تین سال پہلے اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا، بچہ تھا نہیں سو اب اس گھر میں ہم دونوں اکیلے رہتے ہیں۔''

''افسوس ہوا سُن کر۔''

''بہت اچھی خاتون تھی اِس کی بیوی۔ شفیق نے بہت گہرا اثر لیا ہے اپنی بیوی کی موت کا حالانکہ میں نے بہت سمجھایا کہ جو لوگ ہماری زندگیوں سے چلے جاتے ہیں وہ کبھی پلٹ کر نہیں آتے مگر وہ اُسے بھول نہیں پاتا اور نہ ہی اُس کے دُکھ سے نکل پاتا ہے یا شاید مجھے ہی اِس کا دکھ سمجھ نہیں آتا کیوں کہ میں اس رشتے سے ہی ناواقف ہوں۔''

''کیا شادی نہیں کی؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''بس یوں ہی۔''

''تو پھر آپ اُس تکلیف کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں جو ایک بیوی کے چلے جانے سے ہوتی ہے اور خاص طور پر اگر وہ بڑھاپے میں ساتھ چھوڑ جائے تو شوہر کی حالت اُس دودھ پیتے بچے کی سی ہو جاتی ہے جو ماں کے مرنے کے بعد ہر وقت بستر پر پڑا روتا رہتا ہے۔''

اس جملے پر میز پہ چائے رکھتے ہوئے شفیق نے غور سے تیمور مرزا کو دیکھا اور سر جھکا کر واپس چل دیا۔

''آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

میں نے کہا ناں یوں ہی۔ کوئی وجہ نہ تھی اور شاید کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ شادی نہیں کرنی بس پتہ نہیں کیسے ہو گیا۔ جلیل حسن نے سر جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔

اب وہ دونوں بے تکلف دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ ایک انجانا رشتہ دونوں کو بہت جلد قریب لے آیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے حالات اور ماضی سے بے خبر ایک عجیب سی قربت محسوس کر رہے تھے۔

''آپ نے کبھی سمندری طوفان کے بعد کا منظر دیکھا ہے تیمور مرزا؟...... ہر چیز ملیا میٹ ہو جاتی ہے، کچھ نہیں بچتا سوائے گہرے سکوت اور ویرانی کے۔ سو ایسا ہی ایک طوفان میری زندگی میں بھی آیا تھا جس نے سب کچھ ختم کر دیا اور ایک گہرا سکوت چھوڑ گیا میری زندگی میں ہمیشہ کے لیے۔''

''میں مرچنٹ نیوی میں میرین انجینئر تھا۔'' جلیل حسن نے کرسی پر دراز ہوتے ہوئے بتایا۔

سمندر مجھے بہت Fascinate کرتا تھا۔ مہینوں سمندر میں رہنے کے باوجود مجھے کبھی

سمندر سے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بہت گھوما، بہت دنیا دیکھی بہت تھوڑے عرصے میں۔ سمندر میراPassion تھا، اور میرا دوسرا جنون تھا" یاسمین"، جسے سمندر سے خوف آتا تھا۔ وہ پانی سے ڈرتی تھی شاید اُسے فوبیا تھا۔ اُسے پہاڑوں پر رہنا اچھا لگتا تھا اور مجھے اُس کے ساتھ مگر وہ اس شرط پر میرے ساتھ رہنے کو تیار تھی اگر میں مرچنٹ نیوی چھوڑ دوں اور کسی پہاڑ پر اُس کے ساتھ زندگی گزاروں۔ بہت عجیب لڑکی تھی مجھے ایک عجیب مشکل میں ڈال دیتی کہ میں یا اُسے چھوڑ دوں یا سمندر کو، مگر میں کوئی فیصلہ نہ کر پاتا پھر ایک حادثے نے میری یہ مشکل حل کر دی اور دونوں ہی مجھ سے چھٹ گئے۔"

ہم یونان کی بندرگاہ پر لنگر انداز تھے۔ جس دن واپسی کے لیے ہماری روانگی تھی اُسی دن یہ حادثہ ہوا۔ تب میں بہت سوچنے کے بعد سمندر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ جب فیصلہ کر چکا تو یاسمین کو پانے کی سرشاری میں، مَیں تمام Rules کو نظر انداز کر کے بنا کسی کو بتائے پورٹ سے نکل گیا۔ Rules کے مطابق روانگی کے روز عملے کو شِپ چھوڑنے کی اجازت نہ تھی البتہ باقی دِنوں میں یہ پابندی نہیں ہوتی۔ میں چوں کہ سمندر چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا اس لیے ایڈونچر کے موڈ میں نکل پڑا۔ سوچا یاسمین کے لیے کچھ خریدوں اور اُسے سمندر چھوڑنے کی خبر سرپرائز کے طور پر دوں۔ چنانچہ شاپنگ کے موڈ میں، مَیں سب کچھ بالائے طاق رکھ کر نکل پڑا۔

ایک بارونق اور پُر ہجوم بازار (جو قیمتی نوادرات اور پتھروں کی خرید وفروخت کے لیے معروف تھا) سے گزرتے ہوئے محسوس ہوا کہ بھگدڑ سی مچ گئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے؟ پھر گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور دو سنسناتی گولیاں میرے دائیں کندھے اور ٹانگ میں پیوست ہو گئیں۔ بس اتنا یاد ہے مجھے۔ ہسپتال میں ہوش آیا تو پتا چلا کہ میں گذشتہ تین ہفتے سے یہاں ہوں۔ سر میں گہری چوٹ اور زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے ایک طویل بے ہوشی طاری رہی۔ میں کون ہوں، کہاں سے ہوں، کوئی نہیں جانتا تھا۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ شاید سر کی چوٹ میری یادداشت پر اثر انداز ہو

لیکن یادداشت تو سلامت رہی البتہ ٹانگ میں آہنی راڈ ڈال دیا گیا' واقعات کے مطابق اس روز ایک جوہری کی دکان کو لوٹنے کی کوشش کی گئی مگر پولیس کی بروقت مداخلت سے لوٹنے والے بد حواس ہو کر بھاگے اور اپنے بچاؤ کے لیے اندھا دھند فائرنگ کرنے لگے جس کی زد میں میرے علاوہ اور چار لوگ بھی آئے جو مقامی تھے' لیکن میرے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ بعد میں میرے بتانے پر سفارت خانے نے میرے محکمے سے رابطہ کیا۔ تمام واقعات کی تصدیق کے بعد بھی مجھے قریباً چار ہفتے مزید وہاں زیرِ علاج رہنا پڑا۔ اس طرح میں کوئی دو ماہ بعد واپس آیا۔ واپس پہنچ کر مجھے علم ہوا کہ میرے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ میں جان بوجھ کے یونان میں غائب ہو گیا ہوں۔ محکمانہ انکوائری ہوئی' rules توڑنے کے باعث مجھے کسی بھی طرح کی ہمدردی اور رعایت کا مستحق نہ سمجھا گیا اور ٹانگ کی وجہ سے (اگرچہ میں تقریباً ٹھیک ہی چلنے لگا تھا) Medically Unfit قرار دے دیا گیا اور یوں سمندر مجھ سے چھوٹ گیا، ادھر یاسمین نے یہ سوچا کہ میں نے اسے چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے سمندر کو چن لیا ہے۔

سمندر چھوڑنے کے بعد جب میں واپس آیا تو معلوم ہوا کہ یاسمین شادی کر کے اس ملک ہی سے جا چکی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ زندگی میں دو ہی چیزیں میرا جنون تھیں اور دونوں ہی مجھ سے چھوٹ گئیں،، جلیل حسن کے لہجے میں ملال تھا۔

ایک مدت میں دونوں کی جدائی کے دکھ میں مبتلا رہا مگر پھر آہستہ آہستہ دوبارہ زندگی کے بارے میں سوچنے لگا' لیکن تیمور مرزا جب زندگی سے جنون اور دیوانگی نکل جائے تو وہ گذرتی نہیں رک سی جاتی ہے۔ مجھے بھی ایسا لگنے لگا کہ زندگی رک گئی ہے۔ کچھ دن یوں ہی رہنے کے بعد سوچا چلو اب اُس کی خواہش کے مطابق ہی جی کر دیکھتے ہیں چاہے اس کے بغیر ہی سہی۔ اور پھر اس طرح رہنا اچھا لگنے لگا' تنہائی لطف دینے لگی۔ اب زمانہ ہو گیا ہے اسی طرح یہاں رہتے ہوئے جلیل حسن نے ایک طویل سانس کھینچ کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

کیا کبھی اس سے ملنے کی خواہش نہیں ہوتی؟ تیمور مرزا نے پوچھا۔

بہت دفعہ تاکہ میں اس کی بدگمانی دور کرسکوں۔

کیسی بدگمانی؟

وہ بہت بدگمان رہتی تھی کہ میں نے ہمیشہ سمندر کو اس پر ترجیح دی ہے اور اگر کبھی مجھے سمندر اور اس کے بیچ کسی ایک کو چننا پڑے تو میں اسے چھوڑ دوں گا اور میں نے اسے چھوڑ دیا حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ مجھے سمندر سے محبت تھی مگر یاسمین سے کہیں کم۔ وہ کہتے ہیں نا کہ محبت میں بھی درجے ہوتے ہیں میری کوئی بھی خواہش، کوئی بھی جنون اس درجے کو چھو بھی نہ پایا جس درجے پر وہ تھی مگر اس کے دل پر بدگمانی کا تالا پڑا تھا اس نے بنا کچھ جانے ہی مجھے چھوڑ دیا۔ بس میں اسے یہی بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے اسے نہیں چھوڑا۔

دو سال پہلے وہ یہیں بازار میں نظر آئی تھی۔ بائیس سال کے بعد مگر میں بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ پتہ نہیں کہاں میری نظروں سے پھر اوجھل ہوگئی اور پھر نظر نہیں آئی۔ سمندر تو آج بھی اپنی جگہ پر ہے مگر یاسمین کہاں ہے میں نہیں جانتا۔۔۔۔

جلیل حسن کے لہجے میں شکستگی تھی۔

مگر میں جانتا ہوں۔ تیمور مرزا لمبا سانس لیتے ہوئے کُرسی سے اُٹھے اور پنجوں کے بل اُس کے سامنے آبیٹھے۔ جلیل حسن نے بے یقینی سے اُنھیں دیکھا۔

ہاں! میں جانتا ہوں کہ یاسمین مرزا مر گئی۔

کیا؟ جلیل حسن کے منہ سے دبی ہوئی چیخ نکلی۔

میری بیوی یاسمین کا انتقال ہو گیا پچھلے سال۔ اُس کے دل میں سوراخ ہو گیا تھا۔

تیمور مرزا نے جلیل حسن کا کپکپاتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بتایا۔

جلیل حسن نے حیرت سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھا جو یاسمین کا شوہر تھا اور اُسے یہ بتا رہا تھا کہ یاسمین مر چکی ہے۔

کیا واقعی یاسمین؟ انھوں نے پھر بے یقینی سے پوچھا۔۔۔۔ تیمور مرزا نے اثبات میں

سر ہلا کر جھکا لیا۔

جلیل حسن کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ اور سانس کی رفتار بڑھ گئی۔ تیمور مرزا نے اُس کے ہاتھ کو قدرے دبا کر چھوڑ دیا اور واپس اپنی کرسی کے پاس پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو گئے تاکہ جلیل حسن اپنی بے یقینی اور کپکپاہٹ دونوں پر قابو پا لیں۔

آپ کی بیوی کے انتقال کا سُن کر بہت افسوس ہوا۔۔۔۔

جلیل حسن نے سپاٹ اور مضبوط لہجے میں کہا۔ تیمور مرزا نے پلٹ کر دیکھا۔ انھیں اتنی جلدی اُن کے سنبھل جانے پر حیرت تھی۔

ہاں اُس کی موت میرے لیے بھی زندگی کا سب سے بڑا دُکھ ہے۔ تیمور مرزا واپس بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے جلیل حسن کے سامنے آ بیٹھے جس کی آنکھوں میں بے شمار سوال تھے، یاسمین کے بارے میں۔ انھوں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُن کے دل میں جلیل حسن کے لیے حسد اور ہمدردی دونوں موجود تھے۔ تیمور مرزا کو اپنی طرف اس طرح دیکھتے ہوئے پا کر وہ روندھی ہوئی آواز میں بولے۔

دو سال پہلے میں نے اُسے دیکھا تو وہ بالکل......

ہاں دو سال پہلے وہ آخری مرتبہ یہاں آئی تھی اور بالکل ٹھیک تھی مگر یہاں سے جانے کے بعد وہ بیمار پڑ گئی اور پھر تمہاری طرح مجھے بھی چھوڑ گئی۔ تیمور مرزا کی حالت ایک بچے کی سی ہو گئی جو اپنا سب سے پیارا کھلونا کھو جانے پر دکھی ہو جاتا ہے۔

یاسمین کو میں نے بائیس سال پہلے ایک ڈنر پر دیکھا تھا۔ وہ مجھے وہاں موجود تمام لوگوں سے مختلف دکھائی دی۔ پُر وقار اور سنجیدہ۔ مَیں اُس وقت شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ تھا، لندن میں ایک بڑے بزنس کے علاوہ وسیع حلقۂ احباب بھی رکھتا تھا مگر اُن تمام چیزوں کے باوجود ایک نا آسودہ ازدواجی زندگی گزار رہا تھا۔ ذہنی ہم آہنگی نہ ہونے کے باعث میری بیوی بچوں کے ہمراہ مستقلاً پاکستان میں رہتی تھی اور میں لندن میں۔ البتہ سال میں دو ایک مرتبہ ضرور چکر لگا لیتا تھا۔

یاسمین سے ملاقات تک میرے ذہن میں کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں آیا تھا مگر اُس سے ملنے کے بعد اُس کے ساتھ کی خواہش دل میں پیدا ہوئی۔ دوستوں کے سمجھانے کے باوجود اور اُس سے بنا پوچھے ہی میں اُس کے والدین سے ملا۔ میری مضبوط مالی اور سماجی حیثیت کے باوجود وہ میرے بارے میں کچھ تحفظات رکھتے تھے مگر یہ مشکل اُس وقت حل ہوگئی جب یاسمین نے اس شادی کے لیے آمادگی ظاہر کر دی عمروں کے فرق کے باوجود۔ وہ بغیر کسی شرط کے میرے ساتھ رہنے پر تیار تھی۔ چند دوستوں کی موجودگی میں سادگی سے نکاح ہوا اور وہ میرے ساتھ لندن آ گئی۔

یاسمین کی رفاقت اتنی خوب صورت اور بھرپور تھی کہ میں اپنی تمام محرومیاں اور ناآسودگیاں بھول گیا۔ دس سال گزر گئے اور ہمیں خیال بھی نہ آیا کہ ہم وہ تکون نہیں بنا پائے جو بچے سے مکمل ہوتی ہے۔ ہمیں اُس کا افسوس بھی نہ تھا۔ مجھے تو شاید اس لیے بھی نہیں کہ میرے پاس پہلے سے دو بچے تھے اور یاسمین، اس نے تو سارے رشتے ہی مجھ میں تلاش کر لیے تھے۔ وہ نہ صرف سوشل سرکل میں Active تھی بلکہ میرے بزنس سرکل میں بھی Supportive رہی۔ اُس نے مجھے زندگی کے خوبصورت بائیس سال دیئے۔

جلیل حسن تم جس یاسمین کو جانتے تھے وہ بالکل اُس سے مختلف تھی۔ اُس نے بغیر کسی شرط کے میرے ساتھ زندگی شروع کی اور تمام عمر اُسی طرح گزار دی۔ وہ ہمیشہ Non Demanding رہی۔ اُس نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا بلکہ مجھے بہت کچھ دیا، میں تو ہمیشہ Receiving end پر ہی رہا۔

مجھے یاد ہے میں نے جب اُس سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ شہریار (میرا بیٹا) Higher studdies کے لیے یہاں آئے تو اُس نے نہ صرف خوش دلی سے اُسے قبول کیا بلکہ اُسے ایڈجسٹ کرنے میں بھی میری مدد کی۔ وہ اُسے بہت پیار کرتی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد شہریار مجھ سے زیادہ اُس کے قریب ہوگیا اور بہت جلد بورڈنگ ہاؤس چھوڑ کر ہمارے ساتھ شفٹ ہوگیا۔ حالانکہ وہ اِس شرط پر میرے ساتھ لندن آیا تھا کہ وہ اُس گھر میں نہیں رہے گا جہاں یاسمین

رہتی ہے۔ وہ اپنی ماں کے بارے میں بہت جذباتی تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ یاسمین نے اُس کی ماں سے زیادتی کی ہے۔ یاسمین نے کیسے اُسے اپنے قریب کیا، میں سمجھ نہ پایا۔

میں تو اُسے کچھ بھی لوٹا نہ پایا، ان سب کے بدلے میں ہاں البتہ اس کی ایک خواہش ہوتی، ہر سال یہاں پہاڑ پر آنا جسے میں رد نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ اُس نے آج تک مجھ سے کوئی تقاضا نہ کیا تھا۔ میرا جی چاہتا وہ کبھی مجھ سے کچھ مانگے مگر نہیں۔ میں اگر پوچھتا بھی تو وہ ہنس کر ٹال دیتی لہٰذا اُس کی یہ خواہش میرے لیے بہت اہم تھی اور میں ہر سال اُسے لے کر یہاں آ جاتا۔

دو سال پہلے جب وہ آخری مرتبہ یہاں آئی تو شہر یار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ مجھے یاد ہے اُس روز شام کو ہم حسبِ معمول سیر کے لیے نکلے کہ اچانک بارش شروع ہو گئی، ہم بارش سے بچنے کے لیے ایک Gift shop میں گھس گئے اور وقت گزارنے کے لیے چیزیں دیکھنی شروع کر دیں۔ مختلف دست کاریاں، نوادرات، قالین، غالیچے اور منقش برتن۔ کافی بڑی دُکان تھی ہم تینوں یعنی میں، یاسمین اور شہر یار آہستہ آہستہ چلتے دُکان کی مختلف سمتوں کی طرف چل دیئے اور اپنی اپنی دل چسپی کی چیزیں دیکھنے لگے۔ مجھے دیوار پر آویزاں ایک غالیچہ نظر آیا۔ میں چلتا ہوا اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مجھ سے پہلے ایک اور شخص بھی وہاں موجود تھا مگر میری جانب اُس کی پیٹھ تھی۔ غالیچہ واقعی بہت خوب صورت تھا۔ میں نے اُسے خریدنے کا ارادہ کر لیا۔ اتنے میں یاسمین میرے قریب آ کر کھڑی ہوئی اور غالیچہ دیکھنے لگی۔

''خوب صورت ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

ہاں واقعی۔

کیا خیال ہے خرید لیں؟

اگر پسند ہے تو خرید لیں۔

ہماری گفت گو سن کر پاس کھڑے شخص نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ یاسمین کی نگاہ اُس شخص کے چہرے پر پڑی۔ وہ بدحواس ہو کر پیچھے ہٹی اور منقش دھاتی برتنوں سے ٹکرائی۔ برتن

کھنک دار آواز کے ساتھ گرے اور فرش پر پھیل گئے۔ اس ایک لمحے میں جتنی وحشت اور بے یقینی میں نے یاسمین کے چہرے پہ دیکھی وہ نا قابل بیان تھی۔ اُس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی، برتنوں کے شور نے دکان میں موجود دوسروں کو بھی ہماری طرف متوجہ کر دیا۔ شہریار تیز قدموں سے ہماری طرف آیا۔

مما کیا ہوا، اُس نے یاسمین کو کندھوں سے تھام لیا۔

یہاں سے چلو میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ اُس نے میرا بازو پکڑ کر کہا۔

اچھا چلتے ہیں Take it easy۔ میں نے اُس کا ہاتھ تھپتھپایا اور مڑ کر اُس شخص کو دیکھا وہ تم تھے۔ اتنی ہی بے یقینی تمہاری آنکھوں میں بھی تھی۔ میں نے ایک نظر تمہیں دیکھا اور یاسمین کو سہارا دے کر دُکان سے باہر لے آیا تمہیں اُسی طرح حیرت میں چھوڑ کر۔ اُس کی طبیعت کا اچانک بگڑنا ہمارے لیے پریشان کن تھا۔ بارش ہلکی ہو گئی تھی ہم ہوٹل واپس آ گئے۔

وہ رات بڑی عجیب تھی۔ اُس رات پہلی مرتبہ اُس کا سانس اُکھڑا۔ وہ میرے قریب لیٹی تھی مگر اُس نے دوسری طرف کروٹ لے رکھی تھی۔ مَیں بظاہر کتاب پڑھ رہا تھا مگر میری نظر بار بار یاسمین پر پڑتی جو خود کو سویا ہوا ظاہر کر رہی تھی مگر سخت بے چین تھی۔ کافی دیر اِسی طرح بے چین رہنے کے بعد وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

تیمور! مجھے گھٹن محسوس ہو رہی ہے مجھے تھوڑی دیر کے لیے باہر لے چلو۔

اِس وقت......؟

میں نے سائیڈ ٹیبل سے گھڑی اٹھا کر ٹائم دیکھا اڑھائی بجے تھے۔

باہر بہت ٹھنڈ ہے۔

پلیز! تیمور تھوڑی دیر کے لیے......اُس کے لہجے میں التجا تھی۔

اچھا ٹھیک ہے۔ اور میں اُسے شال اوڑھا کر باہر لے آیا۔

وہ بالکل خاموش تھی۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لابی سے نکل کر ہوٹل کے لان میں

لگے لیمپ کے قریب جا کھڑے ہوئے۔

اُس کا چہرہ ابھی تک سفید اور سانس ناہموار تھی۔ کچھ دیر اُسی طرح گزر گئی۔ مجھے ٹھنڈ محسوس ہونے لگی۔

چلیں؟ تمہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔ میں نے غور سے اُسے دیکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا اور وہ خاموشی سے واپس چل دی۔

کچھ طبیعت سنبھلی؟

ہاں بہتر ہوں۔

Sure؟ میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

Sure، وہ نظریں چرا کر بولی۔

اگلے ہی دن یاسمین نے واپسی کے لیے اصرار شروع کر دیا جو میرے اور شہریار کے لیے باعثِ حیرت تھا۔ ابھی تو صرف دس دن ہوئے تھے ہمیں آئے ہوئے اور یاسمین تو پورا مہینہ گزارنے کے باوجود بھی مشکل سے واپسی کے لیے تیار ہوتی مگر اس دفعہ واپسی کے لیے اُس کی ضد ہم سمجھ نہیں پائے۔ میں بنا کچھ پوچھے اُسے واپس لے کر آیا مگر دل میں کئی سوال سر اُٹھانے لگے۔

Gift shop میں ملنے والا شخص کون تھا؟ کیا رشتہ تھا اُس کا یاسمین کے ساتھ۔ اُسے دیکھ کر یاسمین نے ایسا React کیوں کیا؟

شہریار بھی پریشان تھا۔ واپس آ کر یاسمین کا رویہ عجیب ہو گیا تھا یا تو وہ بالکل خاموش رہتی یا پھر بہت بولتی۔ اگر اتفاق سے باتوں میں کبھی اُس واقعہ کا ذکر آ جاتا تو وہ سو طرح کی Justifications دیتی جو نہایت احمقانہ ہوتیں۔ ہمیں اِس طرح دیکھتی گویا اُس کی کوئی چوری پکڑی گئی ہو۔

یہ یاسمین وہ نہ تھی جسے ہم جانتے تھے، جو ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ اگلے سال چھٹیاں ہوئیں تو یاسمین نے جانے سے انکار کر دیا۔

میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

وہاں بہت ٹھنڈ ہوتی ہے۔

مجھے پہاڑ پر نہیں جانا، مجھے اونچائی سے خوف آتا ہے۔ عجیب احمقانہ جواز ڈھونڈتی وہ ہمیں ٹالنے کے لیے، میرے دل میں شک نے سر اُٹھانا شروع کر دیا اور میری حالت عجیب ہونے لگی۔ مجھے اپنا اور اُس کا تعلق بے معنی لگنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا کہ میں نے بائیس سال ایک دھوکے میں گزار دیئے۔ میرے اندر سب کچھ ٹوٹ گیا، سب کچھ بکھر گیا۔ میں خود جو ایک بٹا ہوا شخص تھا مگر اُسے کسی کے ساتھ بانٹنے کا خیال ہی مجھے پاگل کر دیتا تھا۔ اُس کی محبت کی سرشاری اور رفاقت نے مجھے حریص بنا دیا تھا۔

جلیل حسن تم اُس کے لیے میری محبت اور حرص کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والی حرص تھی مگر یہ کیا ہوا کہ میرے اعتماد کو یوں بُری طرح ٹھیس پہنچی۔

مجھے جو دکھ عمر بھر رہا وہ تھا اس کا Non demanding ہونے، مجھ سے خواہش نہ کرنے کا، لیکن اُس کی خواہش کا علم ہونے پر یہ دُکھ اور شدید ہو گیا۔

کیا تھی اُس کی خواہش......؟

اپنا یوں بے وقعت ہونا میں برداشت نہ کر پاتا اور پھر ایک دن نہ جانے میں غصے میں اُسے کیا کیا کہہ گیا وہ بس حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اُس کا چہرہ پھر اُس دن کی طرح سفید ہو گیا۔

ایک لاتعلقی سی آ گئی تھی ہمارے رشتے میں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اُس کا سانس اکثر اُکھڑنے لگا میں اور شہریار چاہتے ہوئے بھی اُس کی طرف متوجہ نہ ہو پاتے اور پھر ایک روز اُس کا سانس اِس بری طرح سے اُکھڑا کہ ہمیں ایمبولینس بلانا پڑی۔ اُسے ہسپتال داخل کر لیا گیا۔ تفصیلی چیک اپ اور ٹسٹوں کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ اُس کے دل میں سوراخ ہے، اور سوراخ بھی اتنا بڑا کہ جس کی سرجری ممکن نہیں۔ یہ بات جہاں ہمارے ہوش

اُڑانے کے لیے کافی تھی وہاں ڈاکٹروں کے لیے بھی باعثِ حیرت تھی کہ اس عمر میں اتنا بڑا سوراخ کیسے ہوسکتا ہے اور اگر یہ پہلے سے تھا تو وہ اب تک کیسے زندہ تھی۔ میڈیکل ہسٹری میں یہ ایک نیا کیس تھا۔ میں نے بہت دن بعد اُسے غور سے دیکھا، اس کا چہرہ بدستور سفید تھا اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بڑے نمایاں تھے۔ میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ میں اُس کی بیماری اور جذباتی اذیت پر کڑھتا، اُس کی تکلیف میرے پورے وجود کو زخمی کر دیتی تھی مگر میں اُس کے قریب نہ جاتا۔

جب تکلیف کی شدت سے اُس کی آنکھیں نم ہوجاتیں تو وہ اُن میں ساجت بھر کر میری طرف دیکھتی اور انجانے میں سرزد ہوجانے والی کسی بے ایمانی پر معافی کی طلب گار ہوتی۔

مَیں اُس کی ساری تکلیف اور درد کو محسوس کرتا تھا، اُس کے آنسو میرے دل پر گرتے تھے مگر میں پتھر ہوگیا تھا، اور پھر ایک دن وہ آنسوؤں اور ساجت سے بھری آنکھیں میری طرف دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں لیکن میری آنکھوں سے ایک بھی آنسو نہ ٹپکا۔ میں اُسے معاف نہ کرسکا...... آنسوؤں سے تر چہرے اور ٹوٹتی آواز میں تیمور مرزا نے کہا۔

جلیل حسن! لیکن اب مجھے ایسے لگتا ہے کہ اُس کے دل میں ہونے والا سوراخ میری روح اور جذبات دونوں کو چھید گیا ہے۔ پتا نہیں اُس کے لیے مرنا مشکل تھا یا نہیں مگر میرے لیے جینا مشکل ہوگیا ہے، لیکن میں پھر بھی جینا چاہتا ہوں اذیت اور احساس جرم کے ساتھ۔ ایک طویل عمر۔ میرا یقین کرو میں واقعی اِسی طرح جینا چاہتا ہوں۔ اُس کے لہجے میں یقین اور دیوانگی بیک وقت موجود تھے۔

تیمور مرزا کی سانس تیز چلنے لگی اُس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ جلیل حسن پتھرائی آنکھوں سے اپنے سامنے بیٹھے اُس عجیب وغریب شخص کو دیکھ رہے تھے۔

تمہیں حیرت نہیں ہوئی جلیل حسن کہ میں تمہارے پاس کیوں آیا ہوں؟ اتنی دور سے آ کر یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں نفرت اور شک دل میں لیے......؟

کیوں کہ میں تمہیں بھی وہ اذیت دینا چاہتا ہوں جس سے میں گزر رہا ہوں کیوں کہ تم

بھی اُس کی موت کے اُتنے ہی ذمہ دار ہو جتنا میں۔

تم اِس جرم میں برابر شریک ہو تو پھر میں اکیلے یہ اذیت کیوں برداشت کروں۔

میں نے بڑی مشکل سے تمھیں تلاش کیا ہے۔ کل پورے تیرہ دن کے بعد تم مجھے پوسٹ آفس کی ڈھلان پر نظر آئے شاید پوسٹ بکس سے اپنی ڈاک نکالنے آئے تھے۔ اُس وقت بارش شروع ہو گئی تھی اور تم تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے آبادی سے ہٹ کر اِس پگ ڈنڈی کی طرف چل دیئے۔ موسم کے تیور دیکھ کر میں وہیں سے پلٹ گیا اور آج یہ پگ ڈنڈی مجھے تم تک لے آئی۔ اب میں تمھیں بھی اس اذیت میں مبتلا دیکھنا چاہتا ہوں۔ تیمور مرزا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔

جلیل حسن، ہم اُسے سمجھے ہی نہیں لیکن وہ ہمیں سمجھتی تھی۔ اُسے پتہ تھا ہماری اوقات کا کہ ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے اُسے دینے کے لیے۔ اِس لیے وہ ہمیشہ ہی Non Demanding رہی......اور اگر دینے پر آئے بھی تو کیا دیا؟

دل میں رکھا بھی اُس کے لیے تو کیا رکھا......؟ ہم اپنے اپنے دل میں شک کا بیج بوتے اور کاٹتے رہے اور وہ مر گئی۔ جلیل حسن کرسی سے اٹھ کر تیمور مرزا کی پشت پر جا کھڑے ہوئے اور کندھوں سے اُنھیں تھام لیا۔

تیمور مرزا! میں تو گذشتہ پچیس سال سے اذیت میں ہوں اور سزا کاٹ رہا ہوں مگر تم صرف دو سال یہ اذیت برداشت نہ کر سکے۔ ارے تم نے تو زندگی کے بائیس خوب صورت سال اُس کے ساتھ گزارے ہیں اور میں تو آج تک صرف تین سال کے تعلق کا کفارہ ہی ادا نہ کر سکا۔ بہت کم ظرف ہو تم۔

تیمور مرزا کے کندھے ڈھیلے پڑ گئے۔ انھوں نے بے بسی سے نظریں اٹھا کر جلیل حسن کو دیکھا اور پوچھا،

کیا لوگ واقعی لوٹ کر نہیں آتے کہ ہم اُن کی بدگمانی دور کر سکیں، کفارہ ادا کر سکیں اور

اذیت سے چھٹکارا پا سکیں؟

جلیل حسن نے نفی میں سر ہلا دیا۔

تم نے خود ہی کہا تھا کہ محبت کرنے والے معاف نہیں کرتے اور اب اُس کی باری ہے...... تیمور مرزا ہم دونوں تمام عمر ایک ہی بازی کھیلتے رہے اور آج دونوں ہی ہار گئے۔ جلیل حسن کو لہجے میں شکستگی تھی۔

شام ڈھلنے لگی تھی سورج کی آخری بچی کھچی کرنوں نے تیمور مرزا کے چہرے کی پژمردگی کو ایک عجیب سا رنگ دے دیا تھا۔ کبھی کبھی طوفان کچھ ایسی نشانیاں بھی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے، تیمور مرزا کے چہرے پر نظریں جمائے جلیل حسن سوچ رہے تھے۔

کچھ وقت یوں ہی گزر گیا، اور پھر تیمور مرزا جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جلیل حسن اُنھیں رخصت کرنے کے ارادے سے اُٹھے مگر تیمور مرزا نے اُنھیں کندھوں سے پکڑ کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔

نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ہونٹ بھینچ کر بولے، بس تم سے اتنا کہنا ہے کہ خود کو کبھی معاف نہ کرنا۔ میری طرح...... اُن کے لہجے میں التجا تھی یہ کہہ کر وہ شکستہ قدموں سے بیرونی پھاٹک کی طرف بڑھے اور پھر بنا مڑ کر دیکھے ہی پھاٹک سے نکل گئے۔

پھاٹک کے چوبی تختوں کے جھولنے کی چرچراہٹ اور اپنے آشیانوں کی طرف لوٹتے پرندوں کے شور نے جلیل حسن کو احساس دلایا کہ طوفان ایک بار پھر آ کر جا چکا ہے۔ مگر اب کی بار سکوت نہیں بلکہ کبھی نہ ختم ہونے والا شور اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

لیلیٰ

کیپٹل سٹی کے فیڈرل لاج کی آخری منزل پر میں کھڑکی سے لگی شہر کے مغربی حصے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک ایسا منظر جو ہوائی جہاز کے اُڑان بھرتے ہی بلندی سے نظر آتا ہے۔ سامنے پھیلی وسیع پنہائی میں سرکاری دفاتر کے سفید رنگ کھڑکی دار افقی اور عمودی اونچے بلاک، سرسبز درختوں میں چھپے سفارت خانوں کا خاموش ڈپلومیٹک ایریا، جدید وضع انٹرکان ہوٹلز، سٹی کلب، سینما ہاؤس اور شاپنگ سنٹرز۔ ایک دوسرے کو کاٹتی کشادہ سڑکوں پر سٹریٹ لیمپس کی روشن قطاروں کے درمیان رینگتی ٹریفک۔

غروب آفتاب کی مدھم سرخی خشک پہاڑوں کے پیچھے تاریکی میں ڈوب گئی۔ آج کے دن کا پہلا ایکٹ ختم ہوا۔ آسمان سے ہر لمحہ اترتے اندھیرے میں اب دوسرا ایکٹ شروع ہو رہا ہے۔ میکانکی طرز حیات کا عادی ہر کردار اپنا اپنا رول نبھا رہا ہے۔ ہر روز کی طرح ایک ہی سکرپٹ ایک ہی فٹ ورک۔ میں بھی اس کانسرٹ کا ایک حصہ ہوں جو دریچے سے اس منظر کا نظارہ کر رہی ہوں۔ میری طرح اور بہت سے لوگ بھی اس اوپن ایئر اسٹیج کو دیکھ رہے ہوں گے۔ ہم سب اس انسانی تماشے کا کوئی نہ کوئی رول نبھا رہے ہیں۔ (شیکسپیئر نہ بھی کہتا تو ایسا ہی ہوتا)

لیلیٰ نے بھی ایک سپر سٹار کا رول نبھایا۔ میں شروع ہی سے اس کا سپورٹنگ کریکٹر رہی......آہ! بے چاری لیلیٰ......آج سہ پہر ہم نے اسے سپرد خاک کر دیا۔

الوداع......بیوٹی کوئین......الوداع!!

ستائیس سال کی بہار آفریں عمر میں مر جانا اس کے رول کا کلائمکس تھا...... کاش یہ کلائمکس بہت دیر بعد آتا...... تیس یا چالیس سال بعد...... ابھی تو بہت سے رول باقی تھے...... شاید وہ بہت جلدی میں تھی...... اس نے ہر کام اسی تیزی سے کیا...... دوسروں کے مقابلے میں ہمیشہ آگے رہنا اسے پسند تھا...... جینے اور مرنے میں بھی...... مجھے اس کی رفتار سے ہمیشہ خوف آیا...... پہلا عشق۔ شادی۔ ایک بچے کی پیدائش۔ طلاق۔ دوبارہ عشق۔ دوبارہ شادی اور پھر علیحدگی اور تنہائی کے یہ مرحلے بہت طوفانی رفتار سے طے ہونے کے بعد آج سہ پہر تمام ہوئے...... زندگی کی اسٹیج پر ایک سپر سٹار کا آخری رول ختم ہوا...... پردہ گرا...... تماشائی قبرستان سے گھروں کو لوٹے...... میرے علاوہ اس کے آفس کے چند ساتھی، فیڈرل لاج کا کلرک اور ننھی ماہ رخ...... اس کا اپنا کوئی نہ آیا...... مجھے بھی اس نے ہسپتال سے فون کر کے بلوایا...... آخری بار سپورٹنگ رول کے لئے۔

کھڑکی سے ہٹ کر میں لیلیٰ کے کمرے میں آئی۔ اس کی یادیں میرے چاروں طرف منجمد تھیں۔ ہسپتال جانے سے پہلے اس نے جو چیزیں جہاں رکھیں اسی جگہ پڑی تھیں۔ بیڈ ریک کے اندر دواؤں کی شیشیاں، ڈاکٹری نسخے، لیٹر پیڈ، قلم، بالوں پر باندھنے کا پھول دار ربر بینڈ، الارم کلاک، ایک میگزین۔ پہاڑ کی طرف کھلتی کھڑکی کے ساتھ لگی ڈریسنگ ٹیبل اور کیبل ٹی وی کی ٹرالی، دیوار پر اولڈ ماسٹر پینٹنگ، پائنتی پر ایک بے ترتیب کمبل، نیچے کارپٹ پر باتھ روم سلیپر...... لگتا تھا ابھی ابھی اٹھ کر کہیں گئی ہے۔ بیڈ کے ایک طرف دیوار پر کالج کے زمانے کی ایک تصویر جس میں وہ بیوٹی کوئین کا اعزاز وصول کر رہی ہے۔ اس کے مقابل دیوار پر ماہ رخ کی پہلی سالگرہ کی وہ تصویر جو میں نے اسے لاہور سے امریکہ بھیجی تھی...... تالیاں بجاتے ہجوم کے آگے سالگرہ کا تاج پہنے ناک اور گالوں پر کیک سے اتری کریم چپکائے کھلکھلا رہی تھی...... اس کا ہینڈ بیگ تکیے کے ساتھ پڑا تھا جو ہسپتال سے ایمبولینس میں اس کے ساتھ آیا۔ پتہ نہیں کب اس نے آخری بار اسے کھولا اور بند کیا...... پھر کبھی نہ کھولنے کے لیے۔

امڈتے آنسوؤں کی دھند میں میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ سب کچھ وہی جو کسی بھی

ورکنگ وومن کے بیگ میں ہوتا ہے۔لپ اسٹک، آئینہ، رول آن پرفیوم،ٹشو پیپرز، چیک بکس، لائف انشورنس لیٹر،ٹیلیفون ڈائری، ٹیلرنگ شاپ کی رسید، چیونگ گم اور دو ٹافیاں، کچھ ریز گاری اور زپ پاکٹ میں چھوٹے بڑے کچھ کرنسی نوٹ، جیسے میں رکھتی ہوں...... جیسے سب رکھتی ہیں۔ یہی لیلیٰ کے بیگ سے نکلا۔ان سب چیزوں کا وارث کون ہوگا؟ مجھے یونہی خیال آیا، چیک بک پر دستخط کس طرح ہوں گے۔ٹیلر کے یہاں کون سا کپڑا کس ڈیزائن میں سلائی ہونا تھا۔دفتر سے اس کا آخری پے چیک کون وصول کرے گا؟اس کی انشورنس کا فیصلہ کیا ہوگا؟ بیگ گود میں رکھے میں ان سوالوں پر افسردہ تھی......سب لوگوں کی طرح لیلیٰ کے بہت سے کام بھی ادھورے رہ گئے جو دوسرے نپٹائیں گے۔آخری سانس تک وہ اپنے کاموں سے آگاہ تھی۔سوچتی ہوگی کہ ہسپتال سے فارغ ہوتے ہی وہ اپنی ترتیب کے مطابق یہ سارے کام مکمل کرلے گی......(موت سے بے خبر رکھنا خدا کا کتنا بڑا احسان ہے)......مگراب یہ سب کچھ دوسرے کریں گے، جیسے اس کی تدفین ہونا تھی، کردی گئی۔اس کمرے کی چیزیں کسی اور جگہ منتقل ہوں گی۔دفتر، بینک، ٹیلر اور فیڈرل لاج کے حسابات طے ہوکر لیلیٰ کی جگہ لینے والے کسی دوسرے انسان کا نیا کھاتہ کھول دیا جائے گا۔

لیلیٰ اور میرا تعلیمی سفر ایک ساتھ شروع ہوکر اکٹھے ختم ہوا۔کالج کی طرح یونیورسٹی میں بھی اس کے حسن کے چرچے رہے۔کالج کے دنوں میں وہ ایک سرکاری نمبر پلیٹ کی گاڑی میں آفیسرز کالونی سے آتی،شوفر دروازہ کھولتا، جب وہ دوپٹہ اور چادر سنبھالتی ایک شانِ دلربائی کے ساتھ کار سے اترتی تو یہ منظر گیٹ پر موجود سٹوڈنٹ لڑکیوں اور انھیں لے کر آنے والے لواحقین کے علاوہ سڑک پار کے شیزان ہوٹل اور اسٹیشنری کی دکانوں کے سامنے لوگوں کی آنکھوں میں بیک وقت کیمرے پر لگے ویوفائنڈر کی طرح لحہ بہ لحہ سرکتا کار سے کالج گیٹ تک چلتا۔لیلیٰ ان سب سے بے نیاز ہجوم میں خود بخود بنتے راستے سے گزرتی اندر چلی جاتی۔چھٹی ہونے پر یہی منظر ایکشن ری پلے کی طرح کالج گیٹ سے واپس کار تک دوہرایا جاتا جہاں عزیز چاچا سٹیرنگ پر بازو رکھے اس کا منتظر ہوتا۔یہ منظر چار سال کالج کا گیٹ کرشنگ واقعہ رہا۔ہم یونیورسٹی میں آئے تو لیلیٰ

کیمپس کے گرلز ہوسٹل میں آ گئی۔ بتایا کہ اس کے ابو کی ٹرانسفر ہو گئی ہے۔ تعلیم ختم ہونے پر نعیم سے شادی کے بعد میں نے گھر سنبھالا اور لیلیٰ ایک این جی او میں چلی گئی۔ اب وہ ورکنگ ویمن ہوسٹل میں رہتی تھی۔ آرمی ویلفیئر کے ایک میلے میں کیپٹن احسان سے راہ و رسم ہوئی جو چند دنوں کی ٹیلی فون چٹ چیٹ کے بعد ہنگامی شادی میں بدل گئی۔

احسان لاہور کے ایک سیاسی خاندان کا طرح دار نوجوان تھا۔ لیلیٰ کا اس سے معاشقہ تپتی دوپہر میں اچانک اٹھتے بگولے کی طرح بڑی تیزی سے ابھرا اور اس نے اسی تیزی کے ساتھ اس کی لپیٹ میں آ کر اس سے شادی کر ڈالی۔ ولیمہ آفیسرز میس میں ہوا۔ احسان کے آفیسر کمانڈنگ کرنل آفتاب عالم نے انہیں ایک فیملی سوئیٹ دلا دیا جہاں وہ صرف تین ماہ رہے جو ہنی مون کی مختصر ترنگ کے بعد چخ چخ سے ہوتے ہوئے طلاق پر ختم ہو گئے۔ لیلیٰ نے اپنا اٹیچی اٹھایا اور آرمی کے فیملی سوئیٹ سے نکل کر دوبارہ ہوسٹل چلی آئی۔ وہ امید سے تھی، ایک دن اس نے بتایا۔ اس صورت حال میں اسے ہوسٹل سے گھر لے آئی۔ یہ میرا اسپورٹنگ رول تھا۔ نعیم نے برا نہیں مانا، وہ بہت لبرل ہے۔ لیلیٰ کا ہوش ربا حسن دیکھتے ہی ہر شخص کا دل اس سے ہمدردی کے لئے اُمڈ آتا ہے۔ نعیم کے لئے بھی شاید یہی کام آیا۔ ماہ رخ پیدا ہوئی تو اسے اس وعدے پر میری گود میں ڈال دیا کہ اس کی ولادت کا کسی کو نہیں بتایا جائے گا۔ اس نے اپنی ٹرانسفر کیپٹل سٹی کرالی جہاں وہ مسز لیلیٰ احسان کی بجائے صرف مس لیلیٰ تھی۔ وہ اکثر ماہ رخ سے ملنے لاہور آتی رہی۔ پھر اچانک پتہ چلا وہ فارن آفس کے ایک کنفرمڈ بیچلر عامر سے شادی کر کے امریکہ جا رہی ہے۔ جانے سے پہلے عامر کو لے کر ملنے آئی، غضب کا وجیہہ شخص تھا۔ کچھ عرصہ خط اور پکچر پوسٹ کارڈ آئے۔ پھر پتہ چلا عامر سے بھی ان بن ہو گئی۔ ڈیڑھ سال بعد لیلیٰ دوبارہ کیپٹل سٹی لوٹ آئی۔

ماہ رخ لیونگ روم کے بڑے صوفے پر ایک بازو نیچے لٹکائے سو رہی تھی۔ یادوں کے ہجوم سے نکل کر میں اس کے قریب آئی...... ماہ رخ،...... ایک چھوٹی سی لیلیٰ...... میں نے اس کا لٹکتا بازو سیدھا کیا اور راہ داری کی طرف کھلتی کھڑکی بند کر دی۔

پچھلے چار دنوں سے میں لیلیٰ کے فلیٹ میں ٹھہری ہوئی تھی ۔ زیادہ وقت ہسپتال میں اس کے ساتھ گزرا کہ ڈاکٹروں کے مطابق کی زندگی کی الٹی گنتی شروع ہو چکی تھی ۔ علاج تقریباً بند تھا، صرف سہولت کی موت کے لئے جدو جہد ہو رہی تھی ۔ کینسر کی آخری سٹیج...... کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لیلیٰ کو یہ سب معلوم تھا۔ وہ بار بار ماہ رخ کو پاس بلاتی اور سینے سے لگا کر سسکیوں کے ساتھ روتی رہتی ۔ ماہ رخ کے لئے اس نے بہت سے کھلونے منگوار کھے تھے ۔ جن سے وہ دن بھر کھیلتی رہتی تھی اور کبھی کبھی پوچھتی ''آنٹی آپ یہاں سے گھر کب چلیں گی؟'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتی ''مما آنٹی کو گھر لے چلونا...... یہ اتنا روتی کیوں ہیں؟'' ماہ رخ کے ان سوالوں پر میں جب رو پڑتی تو وہ حیران ہو کر پھر پوچھتی......مما آپ اور آنٹی دونوں کیوں روتی ہیں؟

ایسے لمحوں میں یوں لگتا جیسے میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سینے سے باہر بکھر جائے گا۔ میں ایک دم آنسو پونچھتی اور ماہ رخ کو بتاتی کہ میرے سر میں درد ہے اسی لئے مجھے رونا آتا ہے۔ وہ مطمئن ہو جاتی اور لیلیٰ کی طرف انگلی کا اشارہ کر کے پوچھتی......کیا آنٹی کے بھی سر میں درد ہوتا ہے جب وہ روتی ہیں؟ مجھے ہاں کہنا پڑتا تو وہ لیلیٰ کے قریب جا کر کہتی...... ''آنٹی میں تمہارا سر دباتی ہوں پھر درد ختم ہو جائے گا، پھر تم رونا بند کر دینا'' بیڈ کے پاس جا کر وہ ننھے ہاتھوں سے اس کے ماتھے کو دبانے لگتی تو لیلیٰ اور بھی شدت سے روتی اور اسے چھاتی سے لگا کر سسکیوں کے ساتھ بے تحاشہ چومنے لگتی ۔ ایسے میں آگے بڑھ کر میں ماہ رخ کو الگ کر دیتی اور سوچتی کہ اللہ یہ کیسا منظر ہے، عنقریب مرنے والی ایک ماں اپنی بیٹی کو یہ بھی نہیں بتا سکتی کہ وہ اس کی آنٹی نہیں ماں ہے۔ یہ راز ماہ رخ کو ہمیشہ کے لئے ایک ماں کے سائے تلے رکھنے کا خاموش معاہدہ تھا جو ہم دونوں نبھا رہی تھیں ۔ اب آخری چند دنوں یا گھنٹوں یا لمحوں کے لئے سچ بتا کر اس کی نفسیات درہم برہم کرنے سے کچھ فائدہ نہ تھا۔ لیلیٰ کی ماما خود اسیری کے دائرے میں پابند ختم ہوتی زندگی کے یہ آخری منظر بھی دیکھ رہی تھی ۔ میرا یہ سپورٹنگ رول اس کے لئے بے حد اطمینان بخش تھا کہ ابھی تک بے اولاد ہونے کے ناطے میں اور نعیم اسے لیلیٰ ہی کی طرح چاہتے تھے ۔

گھر میں لگی کالج کی بیوٹی کوئین کا ایوارڈ لیتے ہوئے لیلیٰ کی تصویر ماہ رخ کو بے حد پسند تھی۔ میں نے جب اس کو بتایا کہ تمہاری آنٹی ہمارے کالج کی سب سے خوبصورت لڑکی تھی اور تصویر میں پرنسپل کی طرف سے دیا گیا گلدستہ اس کی خوبصورتی کا انعام تھا تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، کہنے لگی مما! بڑی ہو کر میں بھی خوبصورت بنوں گی؟۔۔۔ یہ بات اس نے یوں کہی جیسے لیڈی ڈاکٹر پروفیسر بننے کی آرزو کا اظہار ہو۔ میں ہنس پڑی اسے پیار کیا اور کہا ڈولی! تم تو پہلے ہی خوبصورت ہو، بڑی ہو کر تو تم اور بھی زیادہ خوبصورت ہو جاؤ گی۔ اور یہ حقیقت سے بھی زیادہ سچ تھا۔ ماہ رخ ہو بہو اپنی ماں کا چہرا تھی، بالکل چاند...... اپنے نام کی طرح۔

پھر مجھے بھی ہماری مس ایک گلدستہ دے گی؟ اس نے تصویر پر نظریں جمائے یقین دہانی مانگی۔

کیوں نہیں دے گی، ضرور دے گی' میں نے اسے بازوؤں میں لے کر چوما، تم تو ابھی سے بیوٹی کوئین ہو۔

وہ کیا ہوتی ہے؟۔۔۔اسے انگریزی کا یہ ٹائٹل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دیکھو ماہ رخ میں نے ایک ٹیچر کی طرح اسے کوچ کیا، بیوٹی کا مطلب ہے خوبصورت اور کوئین کا مطلب ملکہ یعنی شہزادی...... یعنی خوبصورت شہزادی...... سمجھ گئی نا......؟ اس نے سر ہلا کر کہا۔ ہاں سمجھ گئی مجھے اطمینان ہوا لیکن ساتھ ہی خوف کی ایک لہر مجھے چھو کر گزر گئی۔

میری ننھی خوبصورت شہزادی تم کوئین ضرور بننا لیکن خدا نہ کرے تمہارا نصیب اپنی ماں کی طرح ہو۔ میں نے لرز کر سوچا...... تم بھی خوبصورتی پر نازاں کسی کیپٹن احسان کے ساتھ تین ماہ کی شادی اور ایک بچے کا بوجھ لے کر واپس نہ چلی آنا اور نہ ہی کسی بیوروکریٹ عامر کی عیاشی کا سامان بن کر امریکہ کا لالچ کرنا جہاں سے تمہیں بھاگنا پڑے، علیحدگی کا دکھ سہنا پڑے اور تیزی سے برپا ہونے والے یہ صدمے کینسر بن کر تمہیں وقت سے کہیں پہلے قبر میں اتار دیں۔

دروازے کی گھنٹی بجی...... میں نے شیشے کے سوراخ سے دیکھا' باہر عامر کھڑا

تھا......افسردگی کے باوجود پہلے کی طرح شکیل اور وجیہ......فارن سروس کا اعلیٰ افسر......ان دنوں امریکہ میں کلچرل اٹیچی......اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا جس پر ایئر لائن کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔

آیئے عامر بھائی' بہت دیر کر دی آپ نے ،دروازہ کھول کر میں ایک طرف ہو گئی۔اس کی بجھی بجھی آنکھوں میں معذرت کے سائے تھے۔

واقعی مجھ سے بہت دیر ہو گئی اس نے بریف کیس صوفے پر ڈال دیا۔ پھر چھت کی طرف دیکھ کر ایک لمبی سانس کے ساتھ کہا مگر لیلیٰ نے بھی تو بہت جلدی کی' میں تو ہمیشہ دیر سے ہی آیا کرتا تھا' لیلیٰ جانتی تھی۔ میں چپ رہی' اس کے ہمیشہ دیر سے آنے کی وجہ لیلیٰ مجھے بتا چکی تھی۔ وہ سوئی ہوئی ماہ رخ کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو میں نے اس کے ہونٹوں کی لرزش اور ایک آہ کے ساتھ بار بار چھت کی طرف دیکھنے سے اس کے دکھ کا اندازہ کیا۔ ہونٹ بھینچ کر کچھ دیر آنسو ضبط کئے پھر ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

میں خود شام سے ہی روتے ہوئے لیلیٰ کے ساتھ اپنی طویل رفاقت کا سوچ سوچ کر نڈھال تھی، عامر کو روتا دیکھ کر ایک بار پھر آنسو امڈ آئے۔ کچھ دیر بعد اس نے رومال سے چہرہ صاف کیا اور ایک لمبی آہ بھری۔

لیلیٰ کی شدید بیماری کا علم مجھے پچھلے ہفتے واشنگٹن میں ہوا' میں نے فون پر اسے بتایا تھا کہ آرہا ہوں مگر اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شاید کچھ زیادہ ہی خفا تھی۔ اس نے فون رکھ دیا۔ پرسوں میں نے دوبارہ فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ڈاکٹر نے بتایا کہ زیادہ سے زیادہ ......عامر پھر رونے لگا...... دو دن اور زندہ رہنے کا امکان ہے۔ ایئر پورٹ سے سیدھا ہسپتال پہنچا...... پتہ چلا......لیلیٰ آج صبح ہی......ہم سب سے روٹھ کر چلی گئی' عامر روتے روتے اٹھا اور لیلیٰ کے بیڈ روم میں جا کر دھاڑیں مارنے لگا۔ شور پر ماہ رخ سوتے میں اٹھ کر میرے پیچھے پیچھے بیڈ روم میں آ گئی اور میرا ہاتھ تھام کر حیرانی سے عامر کو دیکھنے لگی۔ بڑی عمر کے کسی آدمی کو اس طرح روتے اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ خالی بیڈ اور اس پر بکھری چیزوں کا منظر عامر کے لئے ناقابل برداشت تھا۔

گہرے تاسف کے ساتھ سر ہلاتے وہ ایک ایک چیز کو دیکھ کر سسکیوں کے ساتھ روتا رہا۔ پھر دیوار پر لگی بیوٹی کوئین کی تصویر کے سامنے مبہوت صورت کھڑا ہو گیا۔ میں اسے اکیلا چھوڑ کر ماہ رخ کا ہاتھ پکڑے لیونگ روم میں چلی آئی تا کہ اکیلے میں وہ اپنا کتھارسس کر سکے۔

رات گئے وہ جانے کے لئے اٹھا اور اگلی صبح میرے ساتھ قبرستان جانے کا کہہ کر فارن آفس کے کسی دوست کے یہاں چلا گیا۔ دوسری صبح خود آنے کے بجائے اس نے فون پر کہا کہ آج صبح نہیں بلکہ شام کو چلیں گے۔ میں نے اس کا انتظار شام پر رکھ دیا۔

فارن آفس کی ایک گاڑی لئے وہ شام کو مجھے لینے آ پہنچا اور ہم ماہ رخ کو ساتھ لئے قبرستان روانہ ہو گئے۔ راستے میں ایک فلورسٹ سے پھول لئے۔ قبر کی جگہ مجھے معلوم تھی مگر عامر مجھ سے پوچھے بغیر لیلیٰ کی قبر پر جا پہنچا جیسے پہلے آ چکا ہو۔ صبح کو آنے کی بجائے شام کو آنے کا مطلب اب سمجھ میں آیا...... لیلیٰ کی کچی قبر کے سرہانے گز بھر اونچا سنگ مرمر کا ایک کتبہ نصب تھا جس پر ولائتی قبرستانوں کی طرح، کنگز انگلش میں لکھا تھا

LAILA

THE UNSUNG BEUTY QUEEN

LIVED FAST

DIED YOUNG

عامر نے خاموشی سے قبر پر پھول بکھیرے، ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور پھر ڈھیلے بازو سامنے باندھ کر سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔ میں نے فاتحہ کہی اور پھر ماہ رخ سے کہا تم بھی آنٹی کو سلام کہو۔

ماہ رخ نے بھی ہماری طرح اپنے ننھے ننھے ہاتھوں کو دعا کے لئے پیالہ کیا اور کہا آنٹی سلام۔۔۔۔ پھر پوچھا ''آنٹی کدھر ہیں؟

میں نے کتبے کی طرف اشارہ کیا اس کے پیچھے چھپی ہوئی ہیں

کوئی دوسرا سوال کرنے سے پہلے میں اس کا ہاتھ پکڑے واپسی کے لئے چل دی۔

لیلیٰ کے بعد اس کے وراثتی اور قانونی امور عامر بھائی کو منتقل ہو گئے کہ آن دی ریکارڈ وہی اس کے وارث تھے۔ ننھی ماہ رخ آف دی ریکارڈ تھی۔ فیڈرل لاج کا فلیٹ بھی فارن آفس کے کوٹے میں عامر بھائی کے نام الاٹ تھا جہاں لیلیٰ مسز عامر کے طور پر مقیم تھی۔ رات گئے تک ہم لیلیٰ سے اپنی اپنی قربتوں کے تذکرے ایک دوسرے کو سناتے رہے۔ دوسری صبح میں ماہ رخ کے ساتھ واپس لاہور چلی آئی۔

مجھے آئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ کیپٹل سٹی کے ایک معروف وکیل کی طرف سے خط ملا......فوری ملئے۔

میں گئی وکیل صاحب نے ایک وصیت نامہ میرے سامنے رکھا جو لیلیٰ نے ان دنوں لکھوایا جب وہ ہسپتال میں تھی۔ ہسپتال کے ایم ایس اور وارڈ انچارج ڈاکٹر اس وصیت کے گواہ تھے۔ عنقریب مر جانے کے یقین اور آخری دستخطوں کے ساتھ لیلیٰ اپنے دنیاوی مال و منال سے اس طرح دستبردار ہوئی۔

1- بنک لاکر میں رکھی جیولری اور تین لاکھ روپے ماہ رخ کی شادی کے لئے میری سرپرستی میں

2- انشورنس پالیسی دو لاکھ روپے شوفر عزیز چاچا کے لئے میری تصدیق کے ساتھ

3- دفتر سے ملنے والی تنخواہ فیڈرل لاج کے کلرک اور چوکیدار کے لئے بحصہ برابر

4- کمرے کا فرنیچر، الیکٹرانکس، ملبوسات وغیرہ عامر بھائی کے لئے......اپنی یادوں کے ساتھ

دنیا سے اٹھ جانے کے بعد لیلیٰ کا یہ پہلا بگ سرپرائز تھا۔ ساتھ میرے لئے بھی ایک سپورٹنگ رول جو آنے والے دنوں میں مجھے ادا کرنا پڑا۔ قانونی کارروائیاں تمام ہونے پر بنک لاکر کی جیولری اور رقم ماہ رخ کے نام منتقل ہو گئی۔ انشورنس پالیسی کی رقم کی ادائیگی کے لئے مجھے عزیز چاچا کو ڈھونڈنا پڑا کہ اس کی شناخت کے بعد اسے رقم دلا سکوں......گویا ایک اور سفر درپیش ہوا۔

صبح کی گاڑی سے میں اپنے میکے شہر میں اتری جہاں کالج کے دنوں میں عزیز چاچا لیلیٰ

کا شوفر رہا۔ یادوں کے ہجوم میں کھوئی آفیسرز کالونی پہنچی۔ ایک صاحب کا ڈرائیور سرکاری گاڑی میں سکول یونیفارم پہنے بچوں کو لے جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ میں نے رکشا میں سے ہاتھ نکال کر اسے روکا اور عزیز چاچا کا پوچھا...... وہ بولا'' بنگلہ نمبر آٹھ جایئے۔''

ایک طرز میں تعمیر ہوئے بنگلوں میں آٹھ نمبر کارنر پر تھا۔ اس امید پر کہ شاید عزیز چاچا مل جائیں میں نے کال بیل پر انگلی رکھ دی۔ ایک ملازم لڑکا مجھے اندر لے گیا اور لان پر مشین چلاتے ادھیڑ عمر مالی سے کہا کہ عزیز چاچا کا پوچھ رہی ہیں۔ مشین کے شور میں شاید اسے سنائی نہیں دیا۔ اس نے مشین بند کی تو میں نے کہا'' بابا' ادھر عزیز نام کے ایک ڈرائیور تھے' کئی سال پہلے وہ لیلیٰ نام کی ایک لڑکی کو گاڑی پر کالج چھوڑنے آیا کرتے تھے۔ میں لیلیٰ کی دوست ہوں مجھے عزیز چاچا سے کام ہے وہ کہاں ملیں گے۔ مالی کیاری پھلانگ کر میرے قریب آیا......عزیز خان ڈلیور......؟ وہ تو بی چلا گیا یہاں سے...... بہت بیمار ہو گیا تھا......شوگر کی بیماری تھی......اوپر سے ٹانگ کا زخم......گاڑی چلانی بند کر دی تھی...... پہلے لمبی چھٹی لی پھر لٹائر ہو گیا......ابھی بھی نوکری کے آٹھ سال باقی تھے بے چارے کے۔

میں نے افسوس کا اظہار کیا اور پوچھا کہاں چلا گیا؟

ادھر ہی اسی شہر میں......اپنی بہن کے گھر رہتا ہے۔ اس نے بتایا۔

بابا میں لاہور سے آئی ہوں عزیز چاچا سے بہت ضروری کام ہے مجھے اس کا پتہ بتا دیں۔

مالی بولا' پتہ تو بتا دوں مگر تمہارا ادھر اکیلے جانا ٹھیک نہیں بیٹا۔ میں بیگم صاحبہ سے ذرا پوچھ لوں پھر تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ اجازت لے کر وہ میرے ساتھ رکشے میں بیٹھ گیا۔

مزاروں قبرستانوں اور فقیروں کے لئے مشہور اس قدیم شہر کے اردگرد اٹھائی گئی فصیل میں مختلف نام کے دروازوں میں ایک حرم گیٹ بھی تھا جس سے نکلتی ہوئی ڈھلوانی سڑک نشاط روڈ کہلاتی تھی۔ ہم اس طرف مڑ گئے۔ یہ ایک تنگ اور گنجان بازار تھا جس کے دونوں طرف سستے ہوٹل' عطائی ڈاکٹر' تکہ کباب کے تھڑے' پشاوری چپل اور تلے دار جوتوں کی دکانوں کے علاوہ

چار پائی، بان اور بانسوں کی دکانیں تھیں۔ نشاط روڈ چوک سے بائیں طرف ایک گلی ارباب نشاط کے معروف علاقہ کو نکلتی تھی اور سیدھے ہاتھ لوہا مارکیٹ کا راستہ تھا۔ میں اس سڑک پر ایک بار امی اور بھائی کے ساتھ چار پائی کا فریم اور بان خریدنے آ چکی تھی اور اس علاقے کی گفتنی ناگفتنی خصوصیات سے بطور ایک شہری آگاہ تھی۔ گفتنی حوالے استاد نزاکت علی، سلامت علی، ان کے بھائی استاد ذاکر اور اختر، معروف مغنیہ اقبال بانو اور کافی کی ایک بے بدل گائیکہ زاہدہ پروین کے تھے جبکہ تقسیم ہند سے قبل اس شہر کی پہچان بدرالنساء عرف بدرو تھی جس سے ملنے دیکھنے اور سننے کے لئے ایک روایت کے مطابق بنگال کے ایک مشہور میوزک کمپوزر رائل بسواس اپنے ہم پلہ موسیقار ماسٹر غلام حیدر کے ساتھ اسی سڑک اور چوک سے گزر کر اس گلی میں مڑتے تھے جہاں کارنر پر آمنے سامنے پان کی دو دکانوں کے درمیان ہمارا رکشہ گزر رہا تھا۔ مجھے ایک دم خوف سے پسینہ چھوٹنے لگا اور میں خود کو بے حد بے شرم اور گھٹیا محسوس کرنے لگی۔

رکشہ واپس لے چلو...... میں چلائی۔ رکشہ واپس مڑا اور میں نے اندازے سے اسے اس دکان کے سامنے کھڑا ہونے کو کہا جہاں سے ایک دفعہ ہم نے چار پائی کا فریم اور بان خریدا تھا۔ میرا خوف کچھ کم ہوا اور ایسے لگا جیسے میں اپنے بھائی اور امی کی حفاظت میں ہوں اور پہلے کی طرح صرف اس دکان تک آئی ہوں۔ سامنے بیٹھا دکان دار مجھے بے حد دوست اور ہمدرد لگا جو کسی بھی ناگہانی آفت سے مجھے بچا سکتا تھا۔

مالی بابا نیچے اترا، پوچھا رکشہ واپس کیوں ہوا۔

بابا آپ کو پتہ ہے یہ کون سا علاقہ ہے؟ میں تقریباً رو دینے کو تھی۔

ہاں پتہ ہے۔ وہ بولا عزیز خان اسی محلے کے آخر میں رہتا ہے اپنی بہن کے ہاں۔

تم مجھے کسی دوسرے راستے سے لے چلو۔ وہ تو شریف لوگ ہیں۔

ہاں ہاں۔ تو میں کب کہتا ہوں کہ وہ شریف لوگ نہیں...... چلو بھائی رکشہ لوہا مارکیٹ لے چلو۔

رکشہ سیدھی سڑک چلا اور مالی کی رہنمائی میں ایک پرائمری سکول کی چار دیواری کا چکر کاٹتا ایک کشادہ گلی میں مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ گلی تقریباً سنسان تھی جس کے دونوں طرف دو منزلہ پختہ مکانوں کی بالکنیوں میں چکیں لٹک رہی تھیں۔ گلی کی دیواروں کے ساتھ بہتی نالیوں کے اوپر دو تین سیڑھیوں کی بلندی پر ہر مکان کے سامنے جنگلے دار تھڑے تھے جن پر گھروں کے دروازے کھلتے تھے۔ مالی بابا نے ایک پیلے رنگ کے دو منزلہ بلڈنگ کے دروازے کی گھنٹی بجائی...... یہ الماس منزل تھی۔

میری ذہنی حالت پھر بگڑنے لگی۔ عزیز چاچا کی بہن اس محلے کی تھی تو وہ کون سا شریف ہو گا جسے بنا تصدیق کے ایک اعلیٰ افسر نے اپنا فیملی ڈرائیور سمجھتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ اپنی بیٹی کو کالج لانے لے جانے کا فریضہ سونپ رکھا تھا۔ لیلیٰ کے والدین کی اس احمقانہ خوش فہمی پر مجھے بے حد افسوس ہوا۔ مگر ساتھ ہی یہ اطمینان بھی کہ لیلیٰ کا حسن خود اس کا سب سے بڑا محافظ تھا۔ اسے دیکھتے ہی اوسان کا بکھرنا عام بات تھی تو گفتگو کا شرف حاصل کرنے کے لئے اتنا حوصلہ کوئی کہاں سے لاتا۔ عزیز چاچا بہر حال معمولی ڈرائیور تھا جو اپنے اوسان سمیٹے ایک روبوٹ کی طرح صرف ڈرائیور تھا اور بڑے افسروں کی خدمت کے آداب سے واقف۔ یہ سوچ کر میں پھر سے پرسکون ہو گئی۔

دوسری گھنٹی پر ایک گورا چٹا نوعمر لڑکا سیڑھیاں اترا جس نے پٹھانوں کی سی کڑھائی دار گول ٹوپی پہن رکھی تھی۔ مالی نے اپنے تعارف کے ساتھ میرے بارے میں اسے آگاہ کیا تو وہ دوبارہ اوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آ کر ہمیں اوپر لے گیا اور ایک کشادہ کمرے میں صوفے پر بٹھا دیا۔ کمرے کی آرائش اہلِ خانہ کے جمالیاتی ذوق کا مظہر تھی۔

ایک طرف کا پردہ سرکا۔ شہابی رنگ و روغن کی قریب پچاس سالہ ایک باوقار خاتون آداب کہہ کر ہمارے روبرو صوفے پر بیٹھ گئی۔ مالی بابا نے اسے الماس بہن کہہ کر مخاطب کیا گویا پہلے سے واقف ہو۔ پھر عزیز خان کا پوچھا تو بتایا گیا نیچے دوا لینے گئے ہیں ابھی آ جائیں گے۔

الماس نے میری جانب دیکھا۔ مالی کے ساتھ میرا آنا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ پوچھا

یہ بی بی کیسے تشریف لائیں؟ بابا بولا۔خود ہی بتائیں گی ۔ میں نے اپنے مختصر تعارف کے بعد جب کالج کے زمانے میں لیلیٰ کے ہم سبق اور گہری دوست ہونے کا بتایا تو الماس کے چہرے پر مسرت کی کرنیں بکھرنے لگیں۔

میں لیلیٰ کی طرف سے عزیز چاچا کے لئے پیغام لائی ہوں۔۔۔۔مخصوص ماحول کے اس کمرے میں مَیں خاصی اَپ سیٹ محسوس کر رہی تھی اس لئے فوری طور پر مقصد کی بات کی۔

کیسا پیغام......؟ انہوں نے پوچھا' پھر بیٹھے بیٹھے آواز دی ۔شہلا یہاں آؤ۔تمہاری باجی کی دوست آئی ہیں......لیلیٰ کی دوست۔

اتنے میں وہی پردہ پھر سرکا......اور خدایا...... یہ کیا؟ میں تقریباً بے ہوش ہوتے ہوتے بچی......ایک دوسری لیلیٰ نے میرے سامنے آ کر آداب کیا......پھر الماس کے ساتھ بیٹھ کر پوچھا۔

امی یہ کون ہیں؟

لیلیٰ کی دوست الماس بولیں۔تمہارے ماموں کے لئے ااس کا کوئی پیغام لائی ہیں۔پھر مجھے مخاطب ہو کر کہا یہ لیلیٰ کی چھوٹی بہن ہے......شہلا۔

میں بدستور حیرت کی گرفت میں تھی اور آنکھیں پھاڑے شہلا کو تک رہی تھی ۔ میری حیرت بھانپ کر الماس مسکرائیں۔دونوں بہنوں کی شکل بہت ملتی ہے۔آپ اسی لئے حیران ہیں؟

جی میں نے سر ہلایا

بالکل آغا صاحب پر گئیں ہیں۔ الماس نے مزید وضاحت کی۔حسن آغا ان کے والد ایرانی ہیں۔کینٹ میں جو دکان بخارا کارپٹس ہے' انہی کی ہے۔پہلی بیگم کے ساتھ مال روڈ پر رہتے ہیں......میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔

مگر لیلیٰ تو عزیز چاچا کے ساتھ آفیسرز کالونی سے ایک سرکاری گاڑی میں کالج آتی تھی......وہ کیسے؟ الماس بیگم بھی مجھے پُراسرار لگیں اس لئے پوچھ لیا۔

افغانی ٹوپی والا لڑکا شربت کی ٹرے اٹھائے داخل ہوا......شہلا نے سروس سنبھالی......

الماس میری طرف متوجہ ہوئیں۔

اس علاقے کا موحول کچھ اچھا نہیں ہے۔دسویں تک تو لیلیٰ میرے ہی پاس رہی پھر کالج کی ضد کرنے لگی تو میں نے آغا جانی سے کہا کینٹ والے گھر ساتھ لے جاؤ وہیں پڑھاتے رہنا مگراس کی بیگم نے لیلیٰ کا وہاں رہنا پسند نہیں کیا۔نہ ہی لیلیٰ اس محلے میں رہنا چاہتی تھی۔تب فیصلہ ہوا کہ ماموں کے پاس آفیسرز کالونی میں رہے گی۔اللہ بخشے اس کی ممانی نے بالکل بیٹی کا سا پیار دیا۔خرچہ آغا صاحب دیتے رہے۔اس گھر کا خرچہ بھی وہی سنبھال رہے ہیں۔شہلا بھی اب کالج جانے کو ہے۔سکول میں اس کا آخری سال ہے۔

دروازے کا پردہ ہٹا کر عزیز چاچا داخل ہوئے۔کمزور پیلے اور دبلے پتلے۔مجھے وہ پہچان نہ پائے۔میں نے اٹھ کر سلام کیا۔انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیراااور بیٹھ گئے۔

یہ لیلیٰ کی دوست ہیں الماس نے تعارف شروع کیا۔کالج میں ساتھ پڑھتی تھیں۔آپ سے ملنے آئی ہیں۔کوئی پیغام ہے لیلیٰ کا۔

عزیز چاچا نے دوبارہ غور سے مجھے دیکھا اور سر ہلایا۔۔۔جیتی رہو! کہاں ہے لیلیٰ آج کل......؟ بہت پہلے امریکہ سے خط آیا تھا اس کا......خوش تو ہے وہ۔۔۔؟ میرا حوصلہ نہ ہوا کہ انہیں لیلیٰ کے بارے میں سچی بات بتاؤں۔مصلحت اور ماحول مختلف تھا۔

جی چاچا بہت خوش ہے۔مجھے کبھی کبھی ٹیلی فون بھی کرتی ہے۔خط تو آتے ہی رہتے ہیں۔میں نے جی کڑا کر کے جھوٹ موٹ کی کہانی سنادی۔شہلا نے مالی بابا کو شربت کا دوسرا گلاس دیا۔عزیز چاچا نے اس کی خیریت دریافت کی۔مالی نے اپنی رہنمائی میں مجھے یہاں لانے کا تذکرہ کیا۔

اچھا کیا' اچھا کیا چاچا سر ہلا کر بولے لیلیٰ کی خیر خبر مل گئی۔۔۔اچھا کیا۔

میں سخت مشکل میں تھی۔سب لوگ لیلیٰ کے انجام سے بے خبر اس کی ایک دوست کے گھر آنے پر خوش تھے۔عزیز چاچا کے لئے انشورنس کلیم کا پیغام میرے حلق میں اٹک کر کانٹا بن چکا

تھا۔ خدایا! میں یہ سب کچھ کیسے بتاؤں؟ اندرونی کرب چھپاتے ہوئے میں بظاہر پُرسکون نظر آنے کی کوشش کررہی تھی۔

آج تو آپ ہمارے ہاں رہیں باجی شہلا نے خالی گلاس میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے اٹھلا کر کہا۔

ضرور رہتی مگر گھر میں ایک چھوٹی سی شہلا میرے انتظار میں ہوگی...... پھر کبھی آوں گی۔

اچھا...... آپ کی بیٹی...... کیا نام ہے اس کا؟' سگی خالہ نے بھانجی کا نام پوچھا۔

ماہ رخ نقلی امی نے جواب دیا۔

ماہ رخ کو کبھی ادھر بھی لائیں۔' سگی نانی نے نواسی کے بارے میں اشتیاق ظاہر کیا۔

ہاں ہاں ضرور۔ دور پار کے عزیزوں کے پاس کبھی کبھی اس شہر میں بھی آنا پڑتا ہے۔ ہم دونوں آئیں گی۔

پھر میں عزیز چاچا سے مخاطب ہوئی۔ چاچا آپ تو بہت کمزور ہو گئے، میرے پاس لاہور آئیں، میں آپ کو وہاں کے سب سے بڑے ڈاکٹر کو دکھاؤں گی۔ آپ میرے بھی ماموں ہیں...... وعدہ کریں...... آئیں گے...... ماموں نے وعدہ کرلیا۔

اور لیلیٰ نے آپ کے لئے کچھ رقم بھی بھیجی ہے وہ آپ کو دوں گی۔ ابھی تو آپ کو ملنے اور بتانے آئی تھی۔ رقم بنک میں پڑی ہے۔

رقم کا سن کر چاچا نے لاہور پہنچنے کا مزید پکا وعدہ کیا۔ الماس منزل کے سبھی لوگوں نے مجھے زینے پر رخصت کیا۔

رات گئے میں لاہور لوٹ آئی۔ جب گھر پہنچی تو ماہ رخ میرا انتظار کرتے کرتے سو چکی تھی۔ نعیم کافی کا مگ سامنے رکھے نیوز بلیٹن سن رہے تھے۔ میرا لٹکتا چہرہ دیکھتے ہی ٹی۔ وی آف کیا۔

کیسا رہا سفر؟ انہوں نے پوچھا۔

کامیاب۔ عزیز چاچا مل گئے تھے۔ لیلیٰ کی رقم کا بتادیا ہے۔ بیمار تھے۔ بہت خوش ہوئے۔

نعیم کافی کا مگ اٹھائے واپس ٹی۔وی کے سامنے بیٹھ کر نیوز سننے لگے۔

میں ماہ رخ کے پہلو میں لیٹ گئی۔ایک نئی ماہ رخ کے ساتھ۔ایک نئی لیلیٰ کی بیٹی کے ساتھ۔جس کی نانی الماس بائی شہر کے ایک بدنام محلے میں بغیر کچھ چھپائے بغیر کوئی روپ بھرے، بلا کسی خوف کے خوشحال زندگی گزار رہی تھی۔لیلیٰ کی ہم شکل چھوٹی بہن بھی ماں ہی کی طرح بغیر کسی بہروپ کے 'صرف شہلا کی صورت' آسائش بھری آہستہ خرام زندگی گزارے گی۔اسے اپنا پسِ منظر چھپانے کے لئے نہ تو عزیز ماموں کو شوفر کہنا پڑے گا' نہ ہی کسی کیپٹن احسان کے اعلیٰ خاندان میں گم ہونے کے لئے فوری شادی کے سراب میں کودنا ہوگا' نہ اپنے لختِ جگر کو کسی اور کو سونپنا پڑے گا' نہ کسی اونچے بیوروکریٹ کے ساتھ واشنگٹن یا کیپٹل سٹی جیسے شہرِ ناپُرساں میں تنہائیوں کے صحرا میں اکیلے بھٹکنا ہوگا......نہ جی جلے گا نہ کینسر ہوگا اور نہ ہی مرگِ جواں اس کا مقدر بنے گا۔

لیلیٰ......سال وسال اوڑھی ہوئی تمہاری کتنی پرتیں ایک ہی دن میں کھل گئیں......مگر میری بہن!......تم پھر بھی برہنہ نہیں لگتی ہو......جس زمانے نے تمہیں خاندانی پسِ منظر کے خوف دیئے تم اسی زمانے کی بیوٹی کوئین رہ چکی ہو......اپنے میرٹ پر......اپنے جلال و جمال کے زور پر......اگر تم یہ سب کچھ مجھ سے نہ بھی چھپاتیں تو بھی میں تمہاری اسیر تھی......ایک میں ہی کیا' تمہیں جس نے دیکھا تمہارا اسیر ہوا......تمہارے بارے میں کوئی بھی انکشاف مجھے تمہارے سحر سے آزاد نہیں کرسکتا۔

اور اب تو تم ماہ رخ کی شکل میں ہمیشہ میرے ساتھ رہو گی......بغیر کسی خوف کے......بغیر کچھ چھپائے......بنا کوئی پرت اوڑھے۔

آسیب

شام تیزی سے گہری ہونے لگی۔ بوڑھا درخت سہ پہر ہی سے باغ میں آنے والوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اپنے لمبے قد کی وجہ سے وہ باغ کی حدود سے بھی بہت پہلے آنے والوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن اسے سب آنے والوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو منتظر تھا اس لڑکی کا جو کچھ دن سے باقاعدہ شام ہونے سے زرا پہلے آتی چہل قدمی کرتی ہوئی باغ میں ایک لمبا چکر لگاتی پھر تھک جاتی تو اس بوڑھے درخت کے نیچے آجاتی۔ اپنا شولڈر بیگ کندھے سے اور پاؤں سے چپل اتار کر ایک طرف رکھ دیتی اور اس کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتی۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھی رہتی، پھر بیگ سے کوئی کتاب نکال کر اندھیرا ہونے تک پڑھتی رہتی۔ اندھیرا زیادہ ہونے پر وہ اپنی چیزیں اٹھاتی، پاؤں میں چپل پہن کر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پارک سے نکل جاتی۔ بوڑھا درخت اسے دور تک جاتا ہوا دیکھتا رہتا حتیٰ کہ وہ گرجا گھر والی ٹھنڈی سڑک کے کنارے لگے درختوں کے جھنڈ میں گم ہو جاتی۔ یہ اس کا معمول تھا اور اب اس بوڑھے درخت کا بھی۔

بہت دنوں تک یہی معمول رہا درخت پر موسم گزرتے رہے لیکن اب تک بس وہ اتنا ہی جان پایا کہ وہ لڑکی کسی لائبریری میں کام کرتی ہے۔ شاید لائبریرین کی مددگار ہوگی۔ بڑی خوشگوار لڑکی تھی۔ لائبریری میں آنے والے سب اسے بہت پسند کرتے تھے وہ بھی سب کا بہت خیال رکھتی۔ اسی طرح باغ میں Brisk Walk کے دوران وہ قریب سے گزرنے والے ہر شخص کا حال پوچھتی۔ اسے ہیلو کہتی اور ہلکا سا جملہ اچھالتی ہوئی گزر جاتی۔ بوڑھے درخت نے محسوس کیا کہ اس

کی طرح دوسروں کو بھی اس لڑکی اور اس کے جملوں کی عادت ہوگئی ہے۔ خاص طور پر وہ ریٹائرڈ پروفیسر جو سر پر گالف کیپ اور ہاتھ میں چھڑی لئے بڑی باقاعدگی سے سیر کے لئے آتا تھا۔ بوڑھا درخت دیکھ رہا تھا کہ آج کل پروفیسر اور لڑکی میں بڑی اچھی دوستی تھی کیونکہ اب پروفیسر پہلے کی طرح آتے ہی سیر شروع نہیں کر دیتا تھا بلکہ اس کا انتظار کرتا اور دیر سے آنے پر اپنے سر کو ذرا سا جھکا کر عینک کے شیشوں کے اوپر سے اسے دیکھتے ہوئے کہتا

لڑکی تم پورے ساڑھے ستائیس منٹ لیٹ آئی ہو۔

سوری سر! آج پتہ ہے کیا ہوا ہے۔ بس میرے نکلنے سے ذرا پہلے ایک Unwanted قسم کا مہمان آ گیا۔ پھر نہ صرف مجھے اسے چائے پلانی پڑی بلکہ اس کے پاس بھی بیٹھنا پڑا۔ اب دیکھیں نہ سر یہ تو بدتمیزی ہے کہ ہم مہمان کو چائے نہ پلائیں اور اس کے پاس نہ بیٹھیں اور وہ بھی اچھے موڈ کے ساتھ۔ اور تو اور مجھے آج اس کی بہت سی احمقانہ باتوں سے اتفاق بھی کرنا پڑا۔ نہ صرف اتفاق بلکہ اس کی تعریف بھی کرنی پڑی۔ اب اتنا کچھ کرنے میں مجھے ساڑھے ستائیس منٹ تو لگ ہی جانے تھے۔"

پروفیسر بڑی دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

اچھا اٹھو اس تفصیل میں تم نے مزید چار منٹ ضائع کر دیے ہیں یہ باتیں چلتے ہوئے بھی ہو سکتی ہیں۔

سوری سر۔ آئندہ میں خیال رکھوں گی۔

لڑکی اب واقعی شرمندہ نظر آ رہی تھی۔ درخت کو پروفیسر پر شدید غصہ آیا کہ اسے کوئی حق نہیں اتنی اچھی لڑکی کو اس طرح شرمندہ کرنے کا۔ اب وہ پروفیسر کے ساتھ ٹہلتی ہوئی جا رہی تھی۔

دیکھو لڑکی تم اتنی اچھی ہو کہ شاید بہت کم لڑکیاں تمھاری عمر میں اتنی اچھی ہوتی ہیں بلکہ اکثر لڑکیاں تو تمام عمر اتنی اچھی نہیں ہو سکتیں۔ تم جس طرح لوگوں کو برداشت کرتی ہو یہ خوبی تمھاری صنف میں خال خال ہی ہوتی ہے۔ لیکن تم جس مستقل مزاجی سے اس کو اپنائے ہوئے ہو مجھے

تمھارے آنے والے دنوں سے خوف آتا ہے۔

لیکن سر میں کیا کروں؟ لڑکی نے پوچھا۔

کچھ زیادہ نہیں۔ فی الحال تم تھوڑی سی بے مروت ہو جاؤ۔ پھر یقیناً تم اور بھی اچھی ہو جاؤ گی۔ جواب میں درخت کو لڑکی کا قہقہہ سنائی دیا۔ اب وہ ٹہلتے ہوئے اتنی دور چلے گئے کہ درخت ان کی باتیں سننے کی بجائے انہیں صرف دیکھ سکتا تھا۔

راستے میں ایک اور پروفیسر بھی ان سے جا ملے جو پڑھانے سے زیادہ آثار قدیمہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ لڑکی ان دونوں کے درمیان چل رہی تھی۔ باغ کے مین گیٹ کے سہ راہے پر دونوں پروفیسر جدا ہو گئے۔

چکر پورا کرنے کے بعد وہ آئی۔ کندھے سے بیگ اتارا۔ چپل اتار کر ایک طرف رکھے اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

درخت نے محسوس کیا کہ آج وہ زیادہ تھک گئی ہے۔ شاید ذہنی طور پر بھی کیونکہ آج اس نے کتاب بھی نہیں پڑھی۔ بس خاموش بیٹھی رہی۔ شاید پروفیسر کی باتوں پر غور کر رہی تھی۔ لیکن درخت تو آج بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے ٹیک لگانے سے اسے عجیب سی سرشاری کا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے بہت دھوپ اور حبس کے بعد ہونے والی بارش نہال کر دیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی تو تھا۔ لیکن جلد ہی وہ بھی اداس ہو گیا یہ سوچ کر کہ لڑکی آج خاموش ہے۔ اندھیرا ہونے تک وہ دونوں اسی کیفیت میں رہے پھر لڑکی اٹھی بیگ اٹھایا اور چپل پہن کر چل دی۔ درخت جانے کب تک اس کے بارے میں سوچتا رہتا مگر اسی وقت اس کی واحد مکین بدمزاج چیل نے آ کر اس کی سوچ کا رخ موڑ دیا۔ جب رات ہو گئی تو اس کا ذہن پھر اس لڑکی کی طرف چلا گیا اور صبح ہونے تک وہ کچھ سوچ کر مطمئن ہو گیا۔

لیکن جب شام ہوئی تو وہ نہیں آئی۔ اور ابھی تو کوئی بھی نہیں آیا، نہ پروفیسر نہ ہی آثارِ قدیمہ میں دلچسپی رکھنے والا اس کا دوست نہ بچے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی شام نہیں ہوئی۔

ہاں واقعی ابھی تو دھوپ میرے سر سے بہت نیچے ہے۔ لیکن مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ شام ہوگئی ہے۔ درخت نے سوچا اور پھر شام کا انتظار کرنے لگا۔ پھر جب شام ہوگئی تو وہ آ گئی۔ آج پروفیسر اور اس کا دوست دونوں نہیں آئے۔ لڑکی نے ان کے مخصوص بنچ کی طرف دیکھا۔ انہیں موجود نہ پا کرا کیلے ہی تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ لڑکی کو دیکھ کر جہاں بوڑھے درخت کو اطمینان ہوا وہاں اسے محسوس ہوا کہ اس کی حالت عجیب ہو رہی ہے۔ اسے لگا کہ جو اس نے رات سوچا تھا وہ شاید نہ کر سکے۔ لیکن پھر اس نے اپنی ہمت بندھائی اور اپنے آپ کو پکا کرنے لگا۔ اکیلی ہونے کی وجہ سے لڑکی نے سیر جلدی ختم کر لی اور آ کر بیٹھ گئی۔ بوڑھے درخت کی حالت بگڑنے لگی۔ لیکن اس نے محسوس کیا کہ لڑکی آج پہلے کی طرح خوشگوار موڈ میں ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کتاب نکالی اور ٹیک لگا کر پڑھنے لگی۔ درخت کی حالت اب سنبھل گئی اور وہ غور سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظر اس کے دودھیا پاؤں پر پڑی۔ ''اس کے پاؤں بہت خوبصورت ہیں شاید میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں اس نے سوچا اور پھر لڑکی کو دیکھنے لگا۔

بالکل مہین سی لڑکی ہے پھر میں کیوں خوف زدہ ہوں اس سے بات کرنے میں۔

اپنی بزدلی کے بارے میں سوچ کر اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا جو کوشش کے باوجود نہ رک سکا اور اس کی چھال کی داڑوں سے بہتے آنسوؤں کا ایک قطرہ لڑکی کے دودھیا پاؤں پر جا گرا۔

لڑکی نے سر اٹھائے بغیر کتاب سے نظر ہٹا کر پاؤں پر گرنے والے قطرے کو دیکھا اور پھر سر اٹھا کر آسمان کی طرف جہاں بادل کا نشان تک نہ تھا۔ ایک لمحہ قطرے کے بارے میں سوچنے کے بعد وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہوگئی۔

سنو!۔۔۔ مجھ سے محبت کرو گی؟

لڑکی نے کتاب سے سر اٹھایا اور اپنے ارد گرد دیکھا لیکن اسے اپنے قریب تو کیا دور بیٹھے اور چلتے پھرتے لوگوں میں کوئی ایسا نظر نہ آیا جو اسے یہ جملہ کہہ سکتا۔ کہیں کتاب کے حرف تو بولنے نہیں لگے۔ لیکن کتاب میں تو اس موضوع اور اس ساخت کا کوئی جملہ نہیں پھر یہ کیا ہے؟ اس

نے شانے اچکا کر سوچا اور کتاب پر سر جھکالیا۔

تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

لڑکی نے کتاب بند کر دی اور تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر آنسوؤں کے بے شمار قطرے اس کے بالوں اور پاؤں پر گرنے لگے۔ اس نے سر اٹھا کر درخت کی طرف دیکھا۔

یہ تم نے کہا؟

ہاں۔ درخت نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

لڑکی خاموشی سے درخت کو دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد درخت نے سسکیوں سے کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ بھلا تم مجھ سے محبت کیوں کرو گی۔ لیکن پتہ نہیں رات کہاں سے میرے دل میں یہ یقین آ گیا کہ تم میری بات مان لوگی کیونکہ تم ایک مختلف لڑکی ہو۔ بس اس یقین نے مجھ سے یہ سب کروایا حالانکہ کل میں سن رہا تھا کہ پروفیسر تمھیں بے مروت ہونے کا مشورہ دے رہا ہے لیکن مجھے رات بھر بلکہ اب بھی یقین ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکتی ہو اور یہی یقین مجھے لے ڈوبا۔ یہ کہہ کر درخت چپ ہو گیا۔ لڑکی تو ویسے ہی چپ ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بوڑھا درخت پھر بولا۔

دیکھو مجھے معاف کر دو۔ میری احمقانہ باتوں سے تمھیں تکلیف ہوئی۔ لیکن تم بہت اچھی لڑکی ہو مجھے یقین ہے کہ تم ضرور مجھے معاف کر دو گی۔

تمھیں کس نے کہا کہ مجھے تمھاری باتیں بری لگی ہیں؟ لڑکی نے کہا۔

ہاں محبت البتہ حماقت ہے چاہے وہ کسی سے بھی کی جائے اور اگر کسی بوڑھے درخت سے کی جائے تو میرا خیال ہے کہ حماقت کا گراف ہرگز اونچا نہیں ہوتا بس حماقت صرف حماقت ہی رہتی ہے۔

تو پھر میری بات سن کر تم خاموش کیوں ہو گئی؟

میں دراصل اس عجیب محبت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ہے نہ عجیب سی بات کہ ایک درخت ایک لڑکی سے محبت کرے یا ایک لڑکی درخت سے۔ خیر تمھیں پریشان ہونے کی

ضرورت نہیں۔ مجھے ہمیشہ ہی سے عجیب چیزیں اور عجیب حادثے اچھے لگتے ہیں سو میں تم سے محبت کر سکتی ہوں۔

لیکن ہے تو ناممکن سی بات۔ درخت نے کہا۔

ہاں ہے تو سہی لیکن جب ناممکن کو خوش دلی سے قبول کر لیا جائے تو وہ ممکن میں بدل جاتا ہے اور میں نے تمھیں خوش دلی سے قبول کر لیا۔

''اوہ دیکھو کتنا وقت ہو گیا ہے اور اندھیرا بھی۔'' لڑکی نے ایک دم چونک کر کہا۔ ''اب میں چلتی ہوں۔'' اس نے بیگ اٹھایا اور چپل پہن کر چل دی۔ جاتے ہوئے پیچھے سے اس کی گلابی ایڑیاں اسے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ وہ دور تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ہمیشہ کی طرح درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گئی اور پھر وہ اگلے دن کا انتظار کرنے لگا۔

لڑکی کا معمول اب بھی وہی رہا لیکن اب وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر کتاب نہیں پڑھتی تھی بلکہ سارا وقت درخت کے ساتھ باتوں میں گزرتا۔ البتہ درخت اپنے اندر ایک تبدیلی سی محسوس کر رہا تھا اور اس تبدیلی کو اس کی واحد مکین بدمزاج چیل نے بھی محسوس کیا۔ واحد مکین اس لئے تھی کہ اس کی موجودگی میں چڑیا یا دوسرے پرندوں نے اس درخت پر ٹھکانا کرنا پسند نہ کیا اور درخت نے بھی کسی اور کے ہونے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ اسے تو اپنی اس مکین سے بھی کچھ خاص دلچسپی نہ تھی۔ بس وہ خود ہی آ گئی اور مکین بن بیٹھی۔ سارا دن تو نہ جانے کہاں رہتی۔ اندھیرا ہونے پر آتی اور کسی شاخ پر دبک کر بیٹھ جاتی۔ بس اتنا سا تعلق تھا اس کے اور اس کی مکین کے بیچ۔ لیکن آج کل اس کی مکین بڑے غور سے اسے دیکھ رہی تھی پر کچھ سمجھ نہ پاتی۔ درخت ہر چیز سے بے نیاز ایک سرشاری اور سرمستی کی کیفیت میں رہتا۔ ہوا چلے نہ چلے اس کی چوٹی جھومتی نظر آتی۔ چیل کے لئے یہ تمام صورت حال نئی تھی اور عجیب بھی۔ سو ایک دن وہ رات گئے درخت سے الجھ پڑی۔

سنو تم کچھ بدل نہیں گئے؟

کیسے؟

یہ تو پتہ نہیں لیکن تم پہلے سے کافی مختلف نظر آتے ہو۔ پہلے چپ چاپ سر جھکائے کھڑے رہتے تھے۔ کبھی کسی اچھے موسم کا انتظار نہ ہوتا تھا تمھیں۔ ایک بارونق جگہ پر ہونے کے باوجود تم کسی ویرانے کا حصہ نظر آتے تھے۔ تمھیں نہ پھل کا غم تھا نہ پھولوں کی کمی کا احساس۔ تمھاری یہی ویرانی مجھے پسند آئی اور میں نے تمھارا انتخاب کیا۔ لیکن آج کل تم جن چونچلوں میں پڑے ہوئے ہو وہ کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے تم پر۔ تم صدیوں پرانے باوقار درخت ہو تمھیں سنجیدگی اور متانت کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے، اور پھر مجھے بھی یہ سب پسند نہیں۔ یہ کہہ کر اس کی مکین تو سوگئی۔ مگر وہ دیر تک جاگتا رہا۔

ایک دن سیر کرتے ہوئے پروفیسر نے لڑکی سے پوچھا۔

کیا تم نے کتابیں پڑھنا چھوڑ دیا ہے؟

نہیں۔ لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟

بھئی اب تم پڑھتے ہوئے نظر جو نہیں آتی ہو۔

ہاں اب میں یہاں کتاب لے کر نہیں آتی بلکہ رات کو ہی پڑھ لیتی ہوں۔

لیکن تم درخت کے نیچے تو بیٹھتی ہو، کیا کرتی ہو وہاں؟

کچھ نہیں۔ بس آج کل درخت کے نیچے بیٹھنا اچھا لگتا ہے۔

دیکھو لڑکی ایسے پرانے درختوں پر آسیب ہوتے ہیں جو اچھی لڑکیوں پر عاشق ہو جاتے ہیں اور پھر بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ پروفیسر نے مذاقاً کہا۔

لیکن سر میں نے تو سنا ہے کہ آسیب صرف خوبصورت لڑکیوں پر ہی عاشق ہوتے ہیں۔

ہاں ٹھیک سنا تم نے۔ لیکن سب آسیب خوش ذوق نہیں ہوتے۔ بس عام سی مگر اچھی لڑکیوں پر مر مٹتے ہیں۔

لڑکی پروفیسر کی بات سن کر کھلکھلا دی۔

تم ہنس رہی ہو۔ تمھیں پتہ ہے کہ جب ایسا ہو جائے تو پھر اس آسیب کو اتارنے کے

لئے لڑکی کے سر میں میخیں ٹھونک دی جاتی ہیں۔

کیا یہ درست ہے۔ آپ نے خود دیکھا ہے؟

میں نے خود تو نہیں دیکھا لیکن پرانی کہانیوں میں ایسا ہی لکھا ہے۔ تم اس پرانے درخت سے دور ہی رہا کرو۔

نہیں سر وہ بے چارہ بہت اکیلا ہے۔

بے وقوف لڑکی درخت کبھی اکیلے نہیں ہوتے۔ اکیلا پن اور تنہائی یہ سب جذباتی کیفیات ہیں اور درخت کا جذبات سے کیا تعلق؟

لیکن سر وہ تو یہی کہتا ہے۔

درخت کہتا ہے؟ پروفیسر نے حیرت سے کہا۔

جی ہاں۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔

اور تمھیں؟ پروفیسر نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

شاید مجھے بھی۔ لیکن ابھی یقین نہیں ہے خود پر۔

سر اس نے جب مجھ سے پوچھا کہ محبت کروگی اور پھر رونے لگا تو مجھے اس کی تنہائی اور بے چارگی پہ ترس آ گیا۔ آپ کو پتہ ہے کہ میں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔

تو تم سمجھتی ہو کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔

پتہ نہیں۔

یہ محبت نہیں۔ تم صرف اور صرف اس پر رحم کھا رہی ہو۔ پروفیسر نے ہلکے سے چیخ کر کہا۔

لیکن سر اب میں مکر نہیں سکتی۔ وہ بے چارا پہلے بھی بہت دکھی ہے۔

لڑکی میرا خیال تھا کہ تم بہت عقل مند ہو۔ تمھاری باتوں میں سیانت ہے لیکن تم انتہا درجے کی احمق ہو۔ تم نے مجھے مایوس کیا ہے۔ پروفیسر باقاعدہ چھڑی زمین پر پٹختا ہوا اسے چھوڑ کر آگے چلا گیا اور لڑکی مسکراتی ہوئی درخت کی طرف مڑی جو بڑی دیر سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا

اور اداس ہو گیا تھا۔

لڑکی نے اس اداسی کو محسوس کیا اور بولی۔ تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لوگ اگر اسے میری حماقت سمجھتے ہیں تو میں نے زندگی میں ایسی بہت سی باتیں کی ہیں جو حماقت کی تعریف میں آتی ہیں۔ اور پھر یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ پتہ نہیں لوگ کیوں مجھ سے عقل مندی کی توقع رکھتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں کہا کہ مجھے عقل مند سمجھو۔ بس مجھے لوگوں کو خوش دیکھنا انہیں خوشیاں دینا اچھا لگتا ہے اور جب تم خوش ہوتے ہو تو مجھے اور اچھا لگتا ہے۔

درخت خاموش ہی رہا لڑکی بھی چپ ہو گئی۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد درخت نے لڑکی سے پوچھا

تم میرے بارے میں کیا جانتی ہو؟

یہی کہ تم ایک درخت ہو بلکہ پرانے درخت ہو

کتنا پرانا؟

مجھے تو ٹھیک سے اندازہ نہیں لیکن پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ ایک صدی۔ شاید اس سے بھی زیادہ۔

کیا تم اگلے جنم پر یقین رکھتی ہو؟

ہاں!

تو پھر سنو۔ میں ہمیشہ سے درخت نہیں تھا۔ تقریباً دو صدیوں پہلے میں بھی انسان تھا۔ شمالی علاقوں کی پہاڑیوں کے ایک ودیا شالہ میں فلسفے کی تعلیم دیتا تھا۔ تمہیں حیرت نہیں ہوئی سن کر۔؟

نہیں۔ مجھے لوگوں کی نسبت حیرت کم ہوتی ہے۔ اب وہ بیٹھے بیٹھے کہنیوں کے بل نیم دراز ہو گئی۔

مجھے فلسفے سے بڑی دلچسپی تھی۔ پڑھنا اور پڑھانا بہت اچھا لگتا تھا۔ خوبصورت جگہ اور

پرسکون فضا میں میرا وقت بہت اچھا گزرتا تھا۔ ہر چیز اچھی لگتی تھی۔لگتا تھا کہ زندگی مکمل ہے اور کچھ کرنے کو باقی نہیں رہا۔ پھر اچانک مجھے پتہ چلا کہ اس ودیا شالہ میں میرا کام مکمل ہو گیا ہے اور مجھے گرم میدانی علاقے کے ودیا شالہ میں بھیج دیا گیا۔ یہاں لوگ بالکل مختلف اور آب و ہوا بھی عجیب تھی۔ میں کچھ بے چین سا رہنے لگا۔ایک بے زاری سی آ گئی تھی مزاج میں۔اب مجھے فلسفہ بھی اچھا نہ لگتا۔ نہ ہی اسے پڑھنا اور نہ ہی اسے پڑھانا۔اس جنم میں بھی میں بہت کم گو اور دوست بنانے میں کنجوس تھا۔تم مجھے فطرتاً بزدل کہہ سکتی ہو اور یہ بزدلی اس جنم میں بھی میرے ساتھ ہی آئی۔ بہر حال عجیب وحشت زدہ سے دن ہو گئے تھے۔ پھر ان وحشت زدہ دنوں میں میں ایک آسیب سے دوستی کر بیٹھا۔ وہ آسیب بھی میری طرح زیادہ سوشل نہ تھا۔اس وقت تو یہی خیال آیا کہ خوب گزرے گی مگر ایسا نہ ہوا۔

کیوں۔کیا وہ اچھا دوست نہ تھا؟

پتہ نہیں۔لیکن شاید تم آسیب کی فطرت سے واقف نہیں ہو وہ جب کسی سے محبت کرتا ہے تو کچھ باقی نہیں چھوڑتا۔انسان چاہے بھی تو اس کے سحر سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

کیا وہ آسیب تم سے محبت کرتا تھا؟

پتہ نہیں۔

اور تم؟

نہیں۔میں بس اس کا عادی ہو گیا تھا۔

کیا تم نے اس سے محبت کرنے کی کوشش کی؟

محبت کوشش سے نہیں ہوتی۔۔۔سو کوشش کیسی؟

تمھارا جی نہیں چاہتا تھا کہ تم کسی سے محبت کرو؟

چاہتا تھا مگر آسیب ایک خوف کی طرح میرے حواس پر سوار رہتا۔ پھر تمھاری ہی طرح ایک لڑکی مجھے ملی ایسی ہی خوشگوار اور ہمیشہ ہنستے رہنے والی۔ مجھے اس ویران جگہ پر ایسی لڑکی کی

موجودگی سے حیرت ہوئی اور پھر کچھ دنوں بعد مجھے لگا کہ مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔ابھی میں بے یقینی میں ہی تھا کہ آسیب کو یقین ہوگیا۔سو میں نے اس آسیب کے خوف سے اس لڑکی سے ملنا چھوڑ دیا۔

کیا تمھیں یقین تھا کہ آسیب لڑکی کو نقصان پہنچاتا؟

ہاں!

لیکن میرا خیال بالکل مختلف ہے۔تم نے کہا کہ تم بزدل تھے۔

ہاں!

تو پھر تم اس کے خوف سے نہیں بلکہ اپنی بزدلی کی وجہ سے اسے چھوڑ بیٹھے تھے۔تم کسی بھی قسم کی مشکل میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔تم چاہتے تو اس آسیب سے چھٹکارا پا سکتے تھے لیکن تم ان میخوں سے ڈرتے تھے جو لوگ تمھارے سر میں گاڑ دیتے۔تم سے وہ تکلیف برداشت نہ ہو پاتی۔

درخت چپ ہوگیا۔

کچھ دیر بعد لڑکی نے پوچھا۔''کیا پھر تم اس لڑکی کو بھول گئے؟

نہیں۔میں تمام عمر ایک اذیت میں مبتلا رہا۔وہ اذیت اتنی شدید تھی کہ میں نے اپنے آپ کو بددعا دی اور اگلا جنم ایک درخت کے روپ میں لیا کہ درخت کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔سو میں اپنے نئے بھیس میں بہت خوش تھا۔مطمئن تھا کہ پھر اچانک اس جنم میں بھی تم آ گئیں۔کیا تمھیں نہیں لگتا کہ تمہارا بھی یہ دوسرا جنم ہے؟۔۔۔۔میں نے تو تمھیں پہچان لیا ہے۔دیکھو اُس جنم میں تو میں تم سے محبت نہ کر سکا لیکن اب میں آزاد ہوں اور تم سے محبت کر سکتا ہوں۔

لڑکی کے تیور بدلنے لگے۔''میں تمھاری بات نہیں سمجھ پائی۔''اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔

اس وقت میں آسیب کی وجہ سے مجبور تھا۔مجھے خوف تھا کہ وہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچائے لیکن اب اس جنم میں میرے ساتھ کوئی آسیب نہیں۔

نہیں تم آج بھی محبت نہیں کر سکتے،لڑکی نے کہا،اس لئے کہ تمھارا آسیب آج بھی

تمھارے ساتھ ہی ہے۔

مجھ پر یقین کرو۔ اس جنم میں میں نے کوئی آسیب قریب نہیں آنے دیا۔ درخت نے کہا۔

تم اس جنم میں اس کو ساتھ لے کر پیدا ہوئے ہو اور وہ آسیب ہے تمھاری بزدلی۔ یہ آسیب تمھیں کسی جنم میں بھی محبت کرنے نہیں دے گا۔ اپنا جرم کسی آسیب کے کھاتے میں نہ ڈالو ہاں تم چاہو تو ہر جنم میں ایک نیا آسیب تلاش کر سکتے ہو جس کے کھاتے میں اپنی تمام ناکامیاں ڈال سکو۔ اسے الزام دے سکو...... تم نے ٹھیک کہا میرا بھی یہ دوسرا جنم ہے۔ اس جنم میں تو خوش گمانی میں میں تمھارے آسیب کو پہچان نہ پائی لیکن اب میں جان گئی ہوں۔ تم سو جنم بھی لے لو تو بزدلی کا آسیب ہر جنم میں تمھارے ساتھ ہوگا۔ تم نے میرا ایک جنم برباد کر دیا۔ اب میں اپنا کوئی جنم تمھارے لئے برباد کرنے کے لئے تیار نہیں۔'' یہ کہہ کر لڑکی اٹھی اور بیگ اٹھایا۔

''لیکن سنو تو سہی۔ میری بات کا یقین کرو۔'' درخت نے کہا۔

''تم بھی سنو وہ واپس مڑی۔ بزدلی کا آسیب سب سے زیادہ خوفناک ہے۔ جس دل میں ٹھکانہ کر لے محبت کو قریب سے بھی گزرنے نہیں دیتا۔ خدا کے لیے میرا یہ جنم برباد نہ کرو۔'' وہ چپل پہن کر چل دی۔

اماوس کی آخری راتیں کچھ زیادہ ہی کالی تھیں۔ درخت اندھیرے اور آنسوؤں کی وجہ سے کوشش کے باوجود جاتے ہوئے اس کی گلابی ایڑیاں نہ دیکھ سکا اور نہ ہی اسے درختوں کے جھنڈ میں گم ہوتے ہوئے۔

برف

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں کسی سرد غار سے نکل کر دھوپ میں آ گئی ہوں، ٹھیک اسی وقت ڈاکٹر نے نمونیہ سے میرے مرنے کی تصدیق کر دی اور مجھے سفید چادر سے ڈھانپ دیا گیا۔

میرا وجود بہت ہلکا پھلکا ہو گیا گویا ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر ختم ہو گیا۔ میں نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی، میرا شوہر اور بیٹا قریب ہی کھڑے تھے۔ میرا بیٹا سسکتا ہوا اپنے باپ کے سینے سے جا لگا۔ یہ بات میرے لئے حیران کن تھی کہ انہیں میری موت سے دکھ ہوا۔ کچھ وقت یونہی گزر گیا ڈاکٹر یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا کہ ہیٹر کو بند کر دیا جائے کیونکہ تدفین صبح ہی ممکن تھی لہٰذا کمرے کی حدت سے Deadbody کے خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

ہیٹر بند کر دیا گیا مگر میں تو بدستور حدت اور گرمی محسوس کر رہی ہوں۔ کافی دیر تک ایک ہی منظر کمرے میں ٹھہرا رہا۔ ساکت و جامد...... پھر میرے شوہر نے بیٹے سے کہا کہ وہ تمام عزیزوں اور دوستوں کو اطلاع کر دے۔ فون کا ڈائل گھومنے لگا اور ایک ہی اطلاعی فقرہ بار بار دہرایا جانے لگا۔ سفید چادریں بچھ گئیں اور مسجد سے سپارے لا کر ان پر رکھ دیے گئے۔ نوکر بڑی خاموشی سے ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

وقفے وقفے سے لوگوں کی آمد شروع ہوئی۔ وہ میرے شوہر کو پرسہ اور میرے بیٹے کو دلاسہ دیتے ہوئے میرے قریب بیٹھنے لگے، میں بڑی دلچسپی سے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ میرا بیٹا گھٹنوں میں سر دیے رو رہا تھا جب کہ میرا شوہر خاموشی سے سر جھکائے بیٹھا تھا اس کا چہرہ سرخ ہو

رہا تھا، میں دور سے اس کے چہرے کی تپش محسوس کر سکتی تھی اگر چہ وہ تپش میرے لئے مانوس نہ تھی۔ایک احساسِ تفاخر سے میری آنکھوں میں چمک سی آ گئی کہ یہ سب کچھ میرے لئے ہو رہا ہے' یہ اہتمام یہ پریشانی اور سب سے زیادہ حرارت اور تپش جو میں محسوس کر رہی تھی، میں کافی دیر تک یہ سب دیکھتی رہی اور اب میں تھکنے لگی ہوں۔ میں چلتی ہوئی آئی اور دیوار کے قریب پڑے ہوئے صوفے پر آ کر بیٹھ گئی' یہ میرے بیٹھنے کی مخصوص جگہ تھی، میں بالکل اسی انداز میں دونوں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھ گئی جیسے پہلے بیٹھا کرتی تھی۔ میں نے اس گھر میں گزرے ہوئے وقت کا زیادہ بلکہ بہت زیادہ حصہ اسی انداز میں بیٹھ کر گزارا تھا۔اسی وقت میری ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بلند آواز سے رو رہی تھی میرا بیٹا اٹھا اور اس سے لپٹ کر رونے لگا۔ بڑا عجیب منظر تھا کمرے میں موجود دوسرے لوگ بھی رونے لگے میں نے اپنے شوہر کے چہرے پر نگاہ ڈالی،اس کے چہرے کی سرخی میں اضافہ ہو گیا تھا۔اس نے ہونٹوں کو سکیڑ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر ہاتھوں کو سختی سے بھینچ رکھا تھا اور اب اس سختی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ماں چلتی ہوئی میرے پلنگ کے پاس آئی، چادر اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا میرے سرد ماتھے پر بوسہ دیا اور روتی ہوئی پلنگ کی پٹی پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں سپارے پڑھنے اور سسکیوں کی مدھم مدھم آوازیں آ رہی ہیں۔لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا،میری ماں مسلسل رو رہی تھی وہ سپارہ پڑھتے ہوئے بار بار میری طرف دیکھ لیتی۔رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی، دبیز قالین کے باوجود فرش پر بیٹھے لوگ سردی محسوس کر رہے ہیں ہیٹر کیوں نہیں چلایا؟

ماں میرے شوہر سے پوچھتی ہے وہ ڈاکٹر کی ہدایت دہراتا ہے تو ماں کہنے لگی تمہارا گھر بھی تو بہت ٹھنڈا ہے۔

ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی ماں، یہ گھر ہی نہیں اس کے مکین بھی بہت ٹھنڈے تھے مگر ماں کو شاید اندازہ اب ہوا تھا22 سال کے بعد۔

کمرے میں خاموشی تھی۔لوگ سردی اور نیند سے بے زار نظر آ رہے تھے بس ایک ہی

رات میں مگر میں نے تو 22 سال گزار دیے تھے اس سرد اور بے سکون ماحول میں مگر کسی کو احساس ہی نہ ہوا۔ میں اکیلی ہی کپکپاتی رہی میری ماں جسے اب تھوڑی ہی دیر میں اس گھر کی ٹھنڈک کا احساس ہو گیا مگر میرا یخ بستہ وجود اسے بھی نظر نہ آیا۔ کیسی برف میرے اندر اتر گئی تھی وہ سمجھ ہی نہ سکی۔ وہ سمجھ بھی کیسے سکتی تھی کہ وہ تو بس ایک عام سی عورت تھی بے حد شفیق بہت پیار کرنے والی بڑی عام سی باتوں سے خوش ہو جانے والی، وہ مطمئن تھی کہ اس کی بیٹی بھی ایسی ہی ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ بیٹیاں ماؤں جیسی ہیں مگر پتہ نہیں میں کیسی تھی۔ کیوں اتنی ڈھیر ساری برف میرے اندر اتر گئی، میں تو بہت محبت کرنے والے لوگوں میں رہتی تھی۔

آپا اماں اور ابا ان سب کی آغوش کی گرمی ابھی تک میرے اندر موجود تھی۔ کالج اور یونیورسٹی میں میری دوست میرے گرم ہاتھ تھام کر کہا کرتی تھیں کہ گرم ہاتھوں والے لوگ بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں اور میں تو رہتی ہی محبت کرنے والوں کے بیچ تھی لیکن جب شادی ہوئی تو احساس ہوا کہ سب لوگ محبت کرنے والے نہیں ہوتے جیسے میرا شوہر اور اسی دن مجھے پتہ چلا کہ میرے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ میں آج تک اس کے اور اپنے رشتے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔

زندگی بڑی عجیب ہو گئی تھی۔ وہ ''چیز'' جسے لوگ میرا شوہر کہتے تھے، اس کا رویہ میرے لئے بڑا عجیب تھا اس کی لاتعلقی اور سرد مہری کی وجہ سے میں خود بھی سرد ہونے لگی حالانکہ وہ ہر شام مجھے یقین دلاتا کہ وہ صرف مجھ سے محبت کرتا ہے آج تک اس نے کسی اور سے کبھی محبت نہیں کی کیونکہ وہ شادی سے پہلے کی محبتوں پر یقین نہیں رکھتا۔ میں حیرت سے اس کی شکل دیکھتی، وہ مجھے بنجر بانجھ زمین کا حصہ لگتا جس میں نمو کی خوبی تھی نہ خواہش۔ آپا مجھے سمجھاتیں کہ وہ تمہارا شوہر ہے اور ہمارے معاشرے میں تحفظ اور پناہ کی علامت۔

مگر آپا مجھے شوہر چاہیے تھا پناہ کے لئے مکان نہیں اور وہ تو واقعی ہی بانجھ زمین پر بنا ہوا ایک سیلن زدہ مکان تھا اور بانجھ زمین میں کبھی کچھ نہیں اگتا، کبھی نشوونما نہیں ہوتی۔

فجر کی اذانیں ہونے لگیں، خواتین اونگھنے لگیں تھیں اور کچھ سو رہی تھیں۔ اذان کی آواز سن کر سب جاگ گئیں اور نماز کے لئے باہر جانے لگیں۔ ماں وہیں نماز پڑھنے لگی کیونکہ میت کو اکیلا نہیں چھوڑتے۔ میں نے بیٹھے بیٹھے کمرے کی چیزوں کو دیکھا، یہ میرا کمرہ تھا میرا بستر جس پر میں اب بھی لیٹی تھی سفید چادر اوڑھے، ڈریسنگ ٹیبل اور ان پر رکھی چیزیں' آئینہ' صوفہ جس پر اب میں ٹانگیں سکیڑ کر بیٹھی تھی، مجھے کسی بھی چیز سے انسیت کا احساس نہیں ہو رہا تھا، کوئی چیز بھی مجھے اپنی اور مانوس نہیں لگ رہی تھی اس کے گھر کے مکینوں کی طرح میری نظریں پھر ماں کی طرف آ گئیں، میں غور سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی، مجھے یاد آیا میری ساس بھی بڑی پابند تھیں نماز کی اور دوسروں سے زبردستی پابندی کرواتی تھیں۔ جب میری شادی ہوئی تو سخت سردی کے دن تھے مگر کیا مجال جو اماں نماز کے لئے صبح اٹھانا بھول جائیں، پھر نماز کے بعد دوبارہ بستر پر جانے کو وہ نحوست خیال کرتی تھیں اور ناپسند کرتی تھیں۔ ان سرد صبحوں کی ٹھنڈ بھی تو میرے اندر سے اتری تھی۔

اماں کی ایک عادت خوب تھی وہ اپنے بیٹے کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرنا پسند کرتی تھیں ایک دفعہ وہ ان کی قمیض پر بٹن ٹانک رہی تھیں جو جانے کیسے ٹوٹ گیا شاید دھوبی سے ٹوٹا ہوگا۔ میں نے بہت چاہا کہ وہ بٹن میں لگاؤں مگر وہ نہ مانیں جیسے میرا کوئی حق ہی نہ تھا اس کے توڑنے میں میں اس بٹن کے ساتھ بہت کچھ سنبھال کے رکھنا چاہتی تھی یادرکھنے کے لئے مگر کچھ نہ رکھ سکی۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ شادی کے بعد جب ہم پہلے سفر پر نکلیں گے تو میں اس سفر کے ٹکٹ سنبھال کر رکھوں گی مگر ہم اس سفر پر ہی نہ جا سکے اماں اور ساجدہ کو اکیلا چھوڑ کر۔ مجھے وہ بارش بھی یاد آ رہی ہے جب میں نے ان سے کہا کہ آج دفتر نہ جاؤ۔ آج ہم دیر تک سوئیں گے، کھڑکی سے بارش دیکھیں گے باتیں کریں گے مگر اماں کو یہ سب پسند نہ تھا۔ انہوں نے کہہ دیا کہ ذرا ذرا سی بات پر چھٹیاں کرنا مجھے ناپسند نہیں سو میں خاموش ہوگئی اور وہ آفس چلے گئے۔

ایسے ہی دنوں میں عثمان میرا بیٹا پیدا ہوا کسی خودرو پودے کی طرح......خودرو پودا ہی تو تھا جس کی نہ خواہش تھی نہ ہی موسم سازگار اور نہ ہی زمین زرخیز مجھے تو اس کی آمد پر حیرت تھی کیونکہ

اب تک تو میں بانجھ اور بنجر ہو چکی تھی اور میرا شوہر واقعی ایک اونچی دیواروں والا ایک مضبوط مکان تھا جو مختلف حصوں میں بٹا ہوا تھا، میں کوشش کے باوجود اس کی مکین نہ بن سکی۔ وہ اتنا ویران اور سرد تھا کہ میں نے جب بھی اس میں داخل ہونے کی کوشش کی اس کے اندر کی برف اور ویرانی نے مجھے دہشت زدہ کر کے پلٹ جانے پر مجبور کر دیا اور پھر میں نے کوشش بھی ترک کر دی۔

عثمان صحرا کے کسی پودے کی طرح خود بخود نشونما پاتا رہا، بہت سارا وقت گزر گیا۔ اماں کا انتقال ہو گیا، ساجدہ کی شادی ہو گئی اور میرے گرد برف کی تہیں مزید دبیز ہوتی گئیں، میں تمام وقت اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے کپکپاتی اِدھر اُدھر پھرتی رہی، پھونکے مار کر اپنے ہاتھ گرم کرنے کی کوشش کرتی مگر شاید میری سانسیں بھی اپنی حدت کھو چکی تھیں۔

اچانک کسی کی آواز مجھے واپس لے آئی۔ یہ ساجدہ تھی اسے دیکھ کر مجھے کپکپی سی آ گئی، سردی کی ایک شدید لہر میری ریڑھ کی ہڈی سے سنسناتی ہوئی گزر گئی اور ٹھنڈ ایک بار پھر میری ہڈیوں میں اترنے لگی کہ وہ بھی تو ذمہ دار تھی اس برف کی جو میری روح اور وجود پر جم گی تھی۔ وہ روتی ہوئی میرے بیٹے سے لپٹ گئی، عورتیں اسے دلاسہ دینے لگیں وہ روتی ہوئی آئی اور میری ماں کے قریب بیٹھ گئی اور دونوں مل کر رونے لگیں۔

دن کافی نکل آیا تھا میت کو غسل دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

میرا شوہر باہر مصروف تھا میت کو جب غسل کے لئے اٹھایا گیا تو کمرے میں بیٹھی تمام عورتیں باہر دھوپ میں چلی گئیں، صرف میری ماں، ساجدہ اور عثمان کمرے میں رہ گئے۔ اسی وقت میرا شوہر کسی کام سے اندر آیا تو ساجدہ کو دیکھ کر رک گیا، ساجدہ بھائی کو دیکھ کر اٹھی اور روتے ہوئے اس کے گلے جا لگی۔ میں نے پھر سے اپنے شوہر کے چہرے کی طرف دیکھا مگر وہ ہمیشہ کی طرح بڑے حوصلے سے کھڑا تھا، میں اب بھی اپنے آپ کو اس کے لئے اتنی ہی غیر اہم لگی جتنی ہمیشہ تھی اور وہ ہمیشہ کی طرح اپنی بہن کے سامنے مجھے دیکھنے کی جرات نہیں کر پا رہا تھا ذرا بھی تو نہیں بدلا تھا وہ۔ ساجدہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی مگر وہ بڑے ضبط سے کھڑا اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا،

بہت ضبط تھا اس میں ۔ میں نے 22 سال اس کے ضبط کا شکار ہو کر گزار دیے۔

لیکن اب شاید اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہیں ۔ ہاں واقعی اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں میں تیزی سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی کہ اس کی آنکھ سے اگر ایک بھی گرم آنسو ٹپکا تو میری وہ تمام برف پگھل جائے گی اور اب میں نہیں چاہتی کہ وہ برف پگھلے ۔ میں اس سرد خانے سے نکل آئی ہوں ہمیشہ کے لئے اب اگر اس سرد خانے میں حرارت آ گئی تو میرے لئے مشکل ہو جائے گی اور میں برف پگھلنے سے پہلے ہی وہاں سے چلی آئی ۔

اعتراف

ساحلی بارشوں کی مٹیالی کائی اور گھنی بیلوں میں چھپا قدیمی گرجا ایک بار پھر زندگی کی حرارت سے محروم ہو گیا۔ نوکیلے مینار کے نیچے دائیں بائیں جھولتی گھنٹی اب ساتویں دن پھر قصبے کے لوگوں کو بلائے گی۔ ڈنگ ڈونگ!۔۔۔ڈنگ ڈونگ!! نماز کے لئے آؤ!۔۔۔نجات کے لئے آؤ!! وہی لوگ پھر سے آئیں گے جو آج عبادت ختم کر کے متوقع بارش سے پہلے پہلے سمندر کنارے لگی سنڈے مارکیٹ میں خریداری کے لئے لپکتے ہوئے چلے گئے۔

بادلوں نے صبح ہی سے آسمان کو پوری طرح سے ڈھانپ رکھا تھا۔ ان کی گرج دار آواز سن کر فادر مائیکل جولیس نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ موسم کی برہم مزاجی کے پیش نظر اس نے ہفتہ وار عبادت کو مختصر اور دعا کو مختصر ترین کر دیا تھا۔ دعا کے دوران اس نے واضح طور پر یہ محسوس کیا کہ دعا کی بجائے لوگوں کا دھیان ان چھتریوں کی طرف تھا جو وہ کسی نا کسی وجہ سے نہ لا سکے۔ شاید موسم پر اعتبار یا اپنے بھلکڑ پن کی وجہ سے۔ بادلوں کی مسلسل گرج نے ان کا دھیان چھتریوں میں ایسا اٹکایا کہ آج انہوں نے بنا سنے ہی فادر کے دہرائے الفاظ پر اعتبار کر لیا اور یہ بھی اندازہ نہ کر پائے کہ آج فادر نے وقت سے پہلے ہی سب کچھ ختم کر دیا۔ فادر کو اندازہ تھا کہ چرچ میں موجود تمام افراد اس سخت سردی میں بھیگنے کا ہرگز ارادہ نہیں رکھتے، سو دعا کے ختم ہوتے ہی تقریباً پانچ منٹ کے اندر پورا چرچ خالی ہو گیا۔ فادر نے اپنی جیبی گھڑی نکال کر وقت دیکھا، ابھی صرف دس بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ وہ چلتا ہوا ہال کے صدر دروازے کی طرف آیا۔ باہر بادلوں نے

اندھیرا کر دیا تھا۔ بادل پھر زور سے گرجا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا واپس آیا۔ روسٹرم سے بائبل مقدس اٹھا کر وہ شیلف کی طرف گیا جس کے اوپر مریم ننھے عیسیٰ کو گود میں لئے کھڑی تھیں۔ فادر جولیس چند لمحے سر اٹھا کر انہیں دیکھتا رہا۔ مڑنے سے پہلے اسے احساس ہوا کہ اس کے علاوہ اور بھی کوئی یہاں موجود ہے۔ وہ آہستگی سے پیچھے گھوم گیا۔ پیچھے ایک شخص برساتی اور ہیٹ پہنے موجود تھا۔ اس شخص کی پراسرار موجودگی نے ایک لمحے کے لیے فادر جولیس کو خوفزدہ کر دیا۔ سردی کی ایک لہر اس نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں محسوس کی لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اپنے حواس بحال کر لیے۔ نو وارد نے اپنا ہیٹ اتار کر سر کو فادر کے سامنے ذرا سا خم کیا اور ہیٹ کو دونوں ہاتھوں سمیت سینے سے لگا کر کھڑا ہو گیا۔

Who are you my son? فادر نے اس کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تم آج صبح کی دعا میں تو شامل نہیں تھے۔ کیا میں درست کہہ رہا ہوں؟ فادر نے ذرا سا سر کو آگے جھکا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

جی ہاں جناب آپ نے ٹھیک کہا۔ میں آج دعا میں شامل نہیں تھا لیکن چرچ میں ہی موجود تھا۔ میرا مطلب ہے کہ ہال سے باہر تھا۔ دراصل میں آپ سے تنہائی میں ملنا چاہتا تھا۔

فادر نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ درمیانے قد، چوڑے نتھنوں اور کشادہ دہانے والا شخص تھا جس کے سر کے بال گھنے تھے، چہرے پر افسردگی اور شرمندگی کے ملے جلے اثرات تھے۔

کہو میں تمھاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟ میرا خیال ہے کہ چھتری لانا تم بھی بھول گئے ہو اور اتفاق سے میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ فادر نے لہجے میں خوشگواریت پیدا کرتے ہوئے کہا کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ نوجوان کے اعصاب کا تناؤ ذرا کم ہو جائے۔

جی آپ درست کہتے ہیں لیکن میں اس وقت چھتری کے لیے پریشان نہیں بلکہ میں تو کسی اور بات کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔

او! اچھا یہ بات ہے۔" فادر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔" میرا خیال ہے تم بے ضرر انسان ہو۔ تم سے کسی ایسی بات کی توقع نہیں جو تمھارے ضمیر پر بوجھ ہو۔ خیر اگر تم واقعی ہی مجھ سے کچھ Share کرنا چاہتے ہو تو مجھے خوشی ہوگی۔ اگر چہ میں تمھیں بالکل نہیں جانتا۔

جانتا تو میں آپ کو بھی نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے سامنے اپنی حماقتوں اور بے ایمانیوں کا اعتراف کر لینے سے میرے ذہنی دباؤ میں یقیناً کمی ہو جائے گی اور مجھے واپسی کے لیے پریشانی کا سامنا نہیں ہوگا۔

تم کس بات کا اعتراف کرنا چاہتے ہو؟ فادر نے پوچھا

فادر میں دس سالوں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔

فادر نے اس انوکھے اعتراف کرنے والے کو غور سے دیکھا۔ اسی لمحے بجلی زور سے چمکی اور بادلوں کی گرج نے ایک پل کے لئے دونوں کو دہلا دیا۔

میں ہمہ تن گوش ہوں۔ فادر نے لمبا سانس لے کر کہا۔

فادر میرا خیال ہے ہمیں بیٹھ جانا چاہیئے کیونکہ مجھے دس سالوں کا اعتراف کرنا ہے۔ فادر نے حیرت سے اس شخص کو دیکھا اور سر ہلاتا ہوا بنچوں کی طرف بڑھ گیا۔ باہر تیز بارش ہونے لگی۔ بنچ پر بیٹھ کر فادر نے سوالیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا جو اب بنچ پر بیٹھ چکا تھا لیکن اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بیٹھنے میں اسے تکلیف ہو رہی ہے۔ اس نے دیکھا فادر جولیس کی نظریں اس کے چہرے پر جم گئی ہیں۔

میرا خیال ہے مجھے اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ فادر میری پوری زندگی سے تو شاید آپ کو کوئی دلچسپی نہ ہو لہٰذا میں اپنی کہانی گزشتہ دس سالوں سے شروع کرتا ہوں جس دن میری بدقسمتی شروع ہوئی۔ پھر ایک مختصر وقفے کے بعد اس نے کہا۔ میں وہ بن مانس ہوں جسے پہلی مرتبہ تجربات کے لیے انسانوں کے ساتھ خلا میں بھیجا گیا؟

فادر جولیس نے بے یقینی سے اپنے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا جو نگاہیں جھکائے بڑی

سادگی سے اعتراف کرنے میں مگن تھا۔

میں نے بہت سے دن انسانوں کے ساتھ خلائی سٹیشن میں گزارے اور کئی مرتبہ گزارے۔ انھوں نے مجھے خلا میں بھیجنے سے پہلے کافی عرصہ میری تربیت ایک خاص انداز میں کی۔ ان کے درمیان رہتے ہوئے مجھے حیرت ہوئی کہ بس مجھ میں ایک سلیقے اور کہیں کہیں تراش خراش کی کسر ہے۔ ان کی اور اپنی عادتوں کے بارے میں سوچا تو کچھ خاص فرق نظر نہ آیا یا پھر ان میں بھی سب عادتیں انسانی نہیں ہوتیں اور میری سب حیوانی نہیں۔ ایک مدت ان کی زمینی تجربہ گاہ میں زیر تربیت رہنے کے بعد مجھے چار انسانوں کے ساتھ جن میں تین مرد اور ایک خاتون تھیں خلا میں بھیج دیا گیا۔ خلا میں وہ لوگ مختلف تجربات کرتے رہے۔ میں ان کے ساتھ بہت مانوس ہو گیا۔ وہ کیا کرتے تھے یا کیا کرنا چاہتے تھے یہ تو مجھے سمجھ نہ آتا لیکن مجھے ان کی صحبت اچھی لگنے لگی اور میں نے بھی انسان بننے کا فیصلہ کر لیا۔ بہر حال اس طرح کے کئی تجربات کئے گئے اور مجھے ہر بار ان کا ساتھی بننے کا شرف حاصل رہا۔ اس دوران میں نے بہت سی انسانی عادتیں سیکھ لیں مثلاً سگریٹ پینا، شراب پینا، ٹیبل پر بیٹھ کر چھری کانٹے سے کھانا اور اب میں ان سے بات چیت بھی کرنے لگا تھا۔ میرے گھنے بال نفاست سے تراش دیے گئے۔ اب میں جنگل سے زیادہ انسانی دنیا کا باسی دکھائی دیتا تھا اگر غور سے نہ دیکھا جائے تو۔ دھیرے دھیرے میں نے اپنی ان تمام خصوصیات سے چھٹکارا پانا شروع کر دیا جو مجھے انسانوں سے علیحدہ کرنے کا باعث تھیں۔ ان جیسا بن جانا اب میری شدید ترین خواہش تھی۔ اس خواہش میں شدت کا سبب شاید کیتھی ہماری خلائی ہمسفر تھی جو شروع میں تو مجھ سے کچھ خوفزدہ تھی حالانکہ وہ ہمیشہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہتی کہ اسے خوف نہیں آتا لیکن میری موجودگی میں اس کے چہرے کی رنگت کی تبدیلی یہ واضح کر دیتی کہ وہ خوف زدہ ہے۔ میں بھی کوشش کرتا کہ اس سے دور رہوں لیکن یہ ممکن نہ تھا کیونکہ خلائی گاڑی کا کیبن بہت زیادہ کشادہ نہ تھا۔ بہر حال آہستہ آہستہ میں نے محسوس کیا کہ اس کا خوف کم ہو رہا ہے اور پھر ہم سب بہت بے تکلف ہو گئے۔ فادر آج آپ جس شکل میں مجھے دیکھ رہے ہیں اس میں کیتھی کا بہت

زیادہ حصہ ہے۔اس نے ہر طرح سے میری نوک پلک سنواری۔میرے سر کے بالوں اور ناخنوں کو تراشا۔ دانت صاف کرنا سکھائے اور چھری کانٹے سے کھانا بھی میں نے اسی سے سیکھا۔ پہلا تجرباتی وقت خلا میں گزارنے کے بعد ہم واپس آئے تو اس نے میرے لیے لباس بھی تیار کروائے۔اب سب سے مشکل مرحلہ میرے لیے بلکہ ہم دونوں کے لیے کوٹ پتلون پہن کر دو ٹانگوں پر چلنا تھا۔میرے لیے جو چیز سب سے زیادہ تکلیف کا باعث تھی وہ میری دم تھی کیونکہ دم کے ساتھ پتلون پہن کر بیٹھنا بہت تکلیف دہ تھا۔آپ تو شاید اندازہ بھی نہیں کر سکتے لیکن انسان جیسا نظر آنے کے لئے مجھے اسے چھپانا تھا اور پھر کیتھی بھی یہی چاہتی تھی کہ یہ دم چھپی رہے۔بہر حال بہت دنوں کی مشکلات اور ریہرسل کے بعد جب میں سوٹ پہن کر کھڑا ہوا تو میں درمیانے قد کا ایک معزز انسان نظر آرہا تھا۔کیتھی نے میری آنکھوں کو سیاہ چشمے سے ڈھانپ دیا تاکہ بغیر پلکوں کے پپوٹوں والی گول آنکھیں نظر نہ آسکیں۔اور ہاں ایک بات کیتھی نے بڑی سختی سے سمجھائی کہ میں ہنستے ہوئے ذرا احتیاط کروں کیونکہ ہنستے ہوئے میرا اوپر والا ہونٹ کچھ اس طرح سکڑ جاتا کہ پورا جبڑا ننگا ہو جاتا جو بہت برا محسوس ہوتا تھا۔لہٰذا میں نے سوچا کہ اب صرف مسکرانے پر ہی اکتفا ہوگا۔کیتھی کی محنت اور میری لگن نے مجھے یہ بنا دیا جو میں آپ کے سامنے ہوں۔

فادر نے بڑے غور سے اجنبی کو دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ اسے پہچاننا خاصا مشکل ہے۔اس نے فادر کی آنکھوں میں حیرت اور ستائش دیکھی تو کہا ”آپ کو حیرت ہوئی ناں۔بالکل اسی طرح جب میں کیتھی کے ساتھ باہر گیا تو کوئی بھی مجھے ایک نظر میں پہچان نہ سکا اور جب پہچان گئے تو ان کی آنکھوں میں حیرت اور کیتھی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔اس نے بے حد خوشی اور سرشاری سے میرے رخسار کا بوسہ لیا۔یہ میرے لیے ایک نیا مگر خوشگوار تجربہ تھا۔بہر حال ہم پھر ایک خلائی مشن پر جا رہے تھے۔کیتھی میری تربیت پر بہت توجہ دیتی لیکن میں اپنے اندر ایک عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔مجھے کیتھی کی قربت اچھی لگنے لگی۔اس کی ذرا سی بے اعتنائی مجھے پریشان کر دیتی۔آہستہ آہستہ مجھے وہ تمام لوگ برے لگنے لگے جو کیتھی سے بات کرتے تھے۔

کیتھی کا دوسروں کے ساتھ ہنسنا مجھے سخت ناگوار گزرتا۔ میرا جی چاہتا کہ میں یہ سب نہ دیکھوں لیکن مجبوری تھی یہ سب دیکھنا اور برداشت کرنا۔ اب میں نے ان کے کاموں میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ اب کے ہم اٹھائیس دن کے لئے گئے تھے، یہ اٹھائیس دن بڑے لمبے ہو گئے میرے مزاج میں ایک چڑ چڑا پن آ گیا۔ میں بات بات پر غرانے لگا۔ اس صورت حال نے سب کو پریشان کر دیا خصوصاً کیتھی اپنی محنت کی بربادی پر سب سے زیادہ پریشان تھی۔ لیکن ہم دونوں ہی اس صورت حال کو نہ سمجھ سکے کہ یہ سب کیوں ہے دوسرے تو خیر کیا سمجھتے۔ اٹھائیس دن بعد جب ہم زمین پر واپس آئے تو میرے بارے میں یہ فیصلہ کر دیا گیا کہ اب میں خلائی تجربات کے قابل نہیں رہا۔ میں بیمار ہو گیا تھا۔ میرے لیے دو راستے تھے ایک جنگل دوسرا شہر کا معروف چڑیا گھر۔ کیتھی کا خیال تھا کہ اب میں چڑیا گھر میں نہیں رہ سکتا کیونکہ اب میں جانور نہیں رہا تھا اور ظاہر ہے کہ چڑیا گھر سے باہر شہر میں رہنا بھی ناممکن تھا۔ سو مجھے جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔ اس میں میری اپنی مرضی بھی شامل تھی۔ کیتھی ایک جیپ میں مجھے چھوڑنے کے لئے آئی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھ سے ملنے آتی رہے گی اور میں بھی جب چاہوں اس سے ملنے آ سکتا ہوں۔ کیتھی کو رخصت کرتے ہوئے احتراماً میں نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اس نے بھی شفقت سے میرے رخسار کو چوما۔ کندھے کو تھپک کر مجھے خدا حافظ کہا اور چلی گئی۔ اب میرے لیے یہ نئی زندگی کی ابتدا تھی۔ میں اس زندگی کو بالکل بھول چکا تھا حتیٰ کہ اپنی بہت سی جبلی عادتیں بھی۔ میں اپنی وضع قطع کے اعتبار سے بھی جنگل کے دوسرے باسیوں سے مختلف تھا اور عادات کے اعتبار سے بھی۔ لہٰذا اب میں گوشہ نشین سا ہو گیا۔

بہت دن چپ رہنے کے بعد ایک دن میں جنگل میں نکل کھڑا ہوا۔ اپنے ہم جنسوں کو عجیب و غریب حرکات کرتا دیکھ کر مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ مثلاً وہ دم کے ساتھ درخت پر الٹے لٹکے پھل توڑ کر بڑی بدتمیزی سے کھا رہے تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا اور وہ اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے، ایک دوسرے کو کچے پھل توڑ توڑ کر مار رہے تھے اور زور زور سے چلا رہے تھے۔ اتنی بے ہودگی

سے ایک دوسرے کا منہ چڑا رہے تھے کہ ان کا اوپر والا ہونٹ پورے کا پورا اوپر کو اٹھ جاتا اور چوڑے دانتوں والا جبڑا انتہائی بھدا دکھائی دیتا۔ مجھے کیتھی یاد آئی کہ وہ کیوں اصرار کرتی تھی کم منہ کھول کر ہنسنے پر۔ بہر حال فادر میں شرمندہ ہو رہا تھا یہ سب دیکھ کر۔

باہر بارش تیز ہوگئی۔ ہوا کے جھکڑوں نے بارش کی بوچھاڑوں کو بے سمت کر دیا۔ تیز ہوا کے جھونکے سے دروازہ کھل گیا اور روسٹرم پر رکھی موم بتی جو فادر جولیس نے بجلی کے چلے جانے پر جلائی تھی بجھ گئی اور دروازے کے پٹ ہوا کے زور سے آپس میں ٹکرانے لگے۔

Just a minute my son میں ذرا دروازہ بند کر کے موم بتی جلا لوں۔ فادر جولیس نے محویت سے نکلتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے دروازے کے ہلتے ہوئے پٹوں کو مضبوطی سے پکڑ کر بند کیا اور بولٹ کر دیا۔ باہر گھرے بادلوں نے اندھیرا کر دیا تھا موم بتی بجھ جانے کے بعد ہال میں بھی گہری تاریکی چھا گئی۔ فادر موم بتی جلا کر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ نوجوان بنچوں کی قطار کے درمیان ٹہل رہا تھا۔ فادر کو واپس بیٹھا دیکھ کر وہ بھی آ کر بیٹھ گیا۔

ہاں تو میں آپ کو بتا رہا تھا کہ جنگل کا ماحول میرے لئے بالکل غیر مانوس سا تھا۔ وہاں کچھ بھی مجھے اچھا نہ لگتا۔ میری ذہنی حالت عجیب ہوگئی۔ ایسے ہی دنوں میں جنگل میں ایک جانوروں کا گروہ ملا جو اپنے آپ کو دانشور خیال کرتے تھے۔ وہ سب جنگل کے نظام کے خلاف تھے اور اکتائے ہوئے تھے۔ میں بہت جلد اس گروپ میں شامل ہوگیا۔ یہ لوگ بہت اچھی لیکن نا قابل عمل باتیں کرتے تھے۔ شاید دانشوروں کی باتیں قابل عمل ہوتی ہی نہیں۔ کبھی مجھے لگتا کہ وہ یہ باتیں بس اچھا وقت گزارنے کے لئے کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے مانوس ہوگیا کیونکہ ان سب کی طبیعت میں وہ ہنگامہ خیزی نہ تھی اور نہ ہی بد تہذیبی جو جنگل کے پورے ماحول میں تھی۔ وہ مجھے بے حد شائستہ لگے۔ شاید بے عمل تھے اور میں ان کی بے عملی کو تہذیب اور شائستگی کہہ رہا ہوں۔ میرا زیادہ وقت اب ان کے درمیان گزرنے لگا۔ لومڑی جس سے مجھے مل کر اندازہ ہوا کہ عیاری اور دانش میں وہ اپنی مثال نہیں رکھتی، وہ میری پریشانی کو جلد سمجھ گئی۔ میں نے دیکھا کہ دوسرے جانور

بھی اس کے مداح تھے سوائے اس الو کے جو اس کا اچھا دوست ہونے کے باوجود اس سے ہر بات پر اختلاف کرنے پر تلا رہتا تھا۔ وہ اس کی عیاری کو خوب سمجھتا تھا اور اکثر ان دونوں کے بیچ تلخی بھی ہو جاتی۔ لیکن پھر بھی وہ اچھے دوست تھے۔ مجھے ان کے ساتھ بیٹھنا اچھا لگتا۔ ان دونوں نے میری کہانی بڑی ہمدردی سے سنی اور اپنے اپنے مزاج اور نقطہ نظر سے مشورہ بھی دیا اور تبصرہ بھی کیا۔ الو کا خیال تھا کہ میں نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا ہے اپنی وضع قطع بدل کر۔ اس نے بڑی بے رحمی سے میرا تجزیہ کیا کہ بغیر پلکوں کے پپوٹوں والی آنکھیں عینک میں اور دم کو پتلون میں چھپا کر کیا واقعی انسان بن گیا ہوں؟ اس کا خیال تھا کہ انسان تو کیا اب میں پورا جانور بھی نہیں رہا تھا۔ میں ان تمام حیوانی نعمتوں سے محروم ہو گیا تھا جنھیں میں شائستگی کی خاطر چھوڑ بیٹھا تھا۔ الو نے واضح طور پر کہا کہ تم نے اپنے اندر کے بن مانس کو مار دیا ہے لہٰذا اب تم کبھی خوش نہیں رہ سکتے۔ تم اگر انسان بن گئے ہوتے تو انسانوں کی دنیا تمھیں قبول کر لیتی اب تم اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ دیکھو تمھارے ساتھی کتنے خوش رہتے ہیں وہ دم جو تمھارے لئے شرمندگی کا باعث ہے وہ اسی کے بل پر الٹا لٹک کر دنیا کو الٹا دیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، بے ساختہ ہنستے ہیں اور تم تو کھل کر ہنس بھی نہیں سکتے کہ کیتھی کو تمھارا چوڑے دانتوں والا جبڑا برا لگتا ہے۔ تم کیسے خوش رہ سکتے ہو۔

ادھر لومڑی کا خیال بالکل اس کے الٹ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں نے اتنا عذاب بھوگ کر یہ تہذیب، شائستگی اور پنجوں پر چلنا سیکھا اب مجھے دوبارہ اپنی جون میں واپس نہیں آنا چاہیے۔ بلکہ مزید مجھے کچھ ایسی حرکتیں کرنی چاہیں جو مجھے مکمل انسان بنا دیں۔ میں جب بھی لومڑی سے ملنے جاتا وہ مجھے ایک نیا مشورہ دے کر روانہ کرتی مثلاً ایک دفعہ اُس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ہرگز سنجیدہ نہ رہا کروں بلکہ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے مجھے اپنے رویے میں ایک نمایاں تبدیلی لانا ہوگی۔ سو جب میں کیتھی سے ملنے گیا تو میرا رویہ یکسر بدل گیا۔ اب میں نے اپنے اوپر ایک جوکر کا لبادہ اوڑھ لیا اور عجیب وغریب حرکات کرنے لگا۔ دوسروں سے انتہائی بے ہودہ مذاق کرنا، ان کے تلخ جملے سن کر یہ ظاہر کرنا کہ مجھے اپنی بے عزتی کا احساس نہیں ہوتا اور سب کو خوش

رکھنا میری شدید ترین خواہش ہے۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میں اب بھی زود رنج تھا۔ کسی کی ذرا سی تلخ بات مجھے بے حد رنجیدہ کر دیتی لیکن میں یہ سب کرنے اور برداشت کرنے پر مجبور تھا، اس لئے کہ یہ میری دانشور دوست کا مشورہ تھا اور ظاہر ہے میری بھلائی کے لئے تھا۔ اسی کے مشورے پر تو میں نے ایک دن شراب پی کر بار میں ہنگامہ کر دیا بالکل اسی طرح جیسے جیک نے ایک دن کیتھی کے فلیٹ میں زیادہ پی کر کیا تھا۔ میری اس حرکت کی وجہ سے کیتھی کو بہت شرمندگی اٹھانی پڑی۔ مجھے بھی افسوس ہوا۔ میں نے یہ تمام واقعہ بھی لومڑی کو بتایا اور ساتھ ہی یہ کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تو اس نے ایک دفعہ پھر مجھے اپنا رویہ بدلنے کا مشورہ دیا۔ اس کے خیال میں اب جب میں کیتھی سے ملنے جاؤں تو میرا رویہ سو فیصد مختلف ہونا چاہیے یعنی اب مجھے جوکر کی بجائے ایک سنجیدہ اور متین شخص نظر آنا چاہیے۔ میرا رویہ Assertive ہونا چاہیے اور اگر ہو سکے تو میں کسی معروف آدمی سے الجھ بھی سکتا ہوں تا کہ لوگوں کی گفتگو کا موضوع بن سکوں۔ چاہوں تو دوستوں سے ناراض ہو جاؤں کہ وہ منت سماجت سے مجھے منائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

الو یہ سب دیکھتا اور سنتا رہتا بس تبصرہ کئے بغیر صرف مسکرا دیتا کیونکہ اب اگر وہ کوئی مشورہ دیتا بھی تو میرے لئے اس پر عمل کرنا شاید مشکل ہوتا کیونکہ آج کل میں اپنی مشیر کے مکمل حصار میں تھا۔ بہر حال فادر میں نے یہ تمام حربے بھی آزما ڈالے لیکن خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا اور میں ایک دفعہ پھر مایوس ہو کر اپنی مشیر کے پاس لوٹ آیا۔ اس نے پھر سنجیدگی سے میرے لئے سوچنا شروع کر دیا اور کچھ دنوں کی سوچ بچار کے بعد اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اب مجھے محبت کرنی چاہیے کیونکہ اب یہی ایک طریقہ ہے جو مجھے انسان ثابت کر دے گا۔ الو اس بات پر بہت ہنسا اس کا خیال تھا کہ میری مشیر کا یہ مشورہ میری بربادی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو گا۔ الو کی ہنسی نے میری دوست اور مشیر کو سخت مشتعل کر دیا اور فادر مجھے بہت افسوس ہوا جب ان کے درمیان لڑائی اتنی بڑھی کہ الو اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے بہت چاہا کہ ایسا نہ ہو مگر میری دوست کا غصہ کم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس کے خیال میں اس کے بنائے گئے پلان پر ریمارکس دے کر الو نے اس

کی توہین کی ہے جب کہ الواس بات پر بضد کہ پلان پر تنقید کرنے سے اس کی توہین کیسے ہوگئی جب کہ وہ بالکل درست کہہ رہا ہے اور اسے اپنی رائے دینے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ فادر وہ دونوں اپنی اپنی بات پر اڑے رہے اور الو چلا گیا۔

تمھارا خیال ہے کہ الو غلط کہہ رہا تھا۔ فادر نے شاید پہلی بار کوئی سوال کیا۔

نہیں میں بھی دلی طور پر اس الو سے متفق تھا کیونکہ مجھے آج بھی اس کے علم اور دانش پر بھروسہ ہے، لیکن میں اپنی دوست کی ناراضگی کی وجہ سے الو سے اتفاق نہ کر سکا۔

پھر تمھاری مشیر نے کیا کیا؟ فادر نے پوچھا۔

اس نے کیا کرنا تھا بس میرے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ اب ایک ہی راستہ ہے کہ انسانوں کا معاشرہ مجھے قبول کرلے۔ اور وہ ہے محبت۔ لیکن اس کے لئے کیا کیا جاتا ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ سو اس نے میری بڑی مدد کی۔ اس نے مجھے سکھایا کہ محبت کے آداب کیا ہوتے ہیں۔ کسی خاتون سے اظہار محبت کس طرح کیا جاتا ہے۔ اس نے باقاعدہ مجھے اس کی ریہرسل کروائی۔ اب میں اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اب مجھے انسانی معاشرہ ضرور قبول کرلے گا بس مجھے اپنی دم چھپا کر رکھنی ہوگی۔ اور اگر میں واقعی کامیاب ہو گیا تو پھر میرے اور انسان کے بیچ جو بال برابر فرق رہ گیا ہے، وہ ختم ہو جائے گا۔ مجھے ایک دم کیتھی کا خیال آیا اور میں نے فوری طور پر اس سے ملنے کا فیصلہ کرلیا۔ اگلے دن جب میں کیتھی کے فلیٹ پر پہنچا تو اس نے بڑی بے تابی اور خوشی سے بتایا کہ اس نے جیک سے منگنی کرلی ہے اور آئندہ بہار میں وہ شادی کرنے والے ہیں۔ جیک کو میں بھی جانتا تھا، وہ دو دفعہ خلائی سفر میں ہمارا ساتھی رہا تھا۔ کیتھی کی اس بات نے مجھے اداس کر دیا لیکن میں نے فوری طور پر اپنے آپ پر قابو پا لیا کیونکہ میں کیتھی کی خوشی کو اداسی میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ میں بہت دن کیتھی کے ساتھ رہا، اس کے ساتھ گھومنے جاتا لیکن اداسی ختم نہ ہوئی۔ ایک دن کیتھی نے اخبار میں قلمی دوستی کا کالم دیکھا تو مشورہ دیا کہ مجھے قلمی دوست بنانے چاہیں۔ سو میں نے سوزن نامی ایک باروبیٹرس سے قلمی دوستی کرلی۔ فادر انہی دنوں

مجھے محسوس ہوا کہ اب پتلون پہن کر بیٹھتے ہوئے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ دم والی جگہ پر ایک زخم بن گیا لیکن میں نے کیتھی کو بتانا مناسب نہ سمجھا کہ وہ پریشان ہوگی اور پھر تکلیف زیادہ بھی نہ تھی، میں نے سوچا چند دن میں زخم ٹھیک ہو جائے گا۔ سوزن کے ساتھ میری خط و کتابت جاری رہی اور پھر ایک دن میں نے ایک خط میں اس سے اظہار عشق کر دیا اور اس کی خبر اپنی جنگل والی دوست کو بھی دے دی۔ میری اس کامیابی پر وہ بہت خوش ہوئی، اس نے چند قیمتی مشوروں کے علاوہ یہ مشورہ بھی دیا کہ اب مجھے سوزن سے باقاعدہ ملنا چاہیے لہٰذا میں نے اگلے دن واپس آ کر سوزن سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا جسے سوزن نے بخوشی قبول کر لیا اور جلد ہی ملنے کا وعدہ کیا۔ فادر اب میرا زخم بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ مجھے بیٹھنے میں کافی دقت ہونے لگی، میں نے کیتھی سے اس بات کا ذکر کر دیا۔ وہ فوری طور پر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ ڈاکٹر نے زخم دیکھنے کے بعد بتایا کہ دم کی جڑ میں پھنسی سی بن گئی ہے جس کے ناسور بننے کا خطرہ ہے کیونکہ دم کو ایک طویل عرصہ تک چھپا کر رکھا گیا اور پھر پتلون پہن کر بیٹھنے سے دم پر جگہ جگہ زخم بھی ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اب پتلون پہننی بالکل چھوڑ دی جائے اور دم کو اس کی قدرتی حالت میں رہنے دیا جائے تو زخم بھرنے کا امکان ہے لیکن پھر بھی ڈاکٹر زیادہ مطمئن نہ تھا کیونکہ علاج میں کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ اب علاج بھی جاری تھا اور سوزن سے خط و کتابت بھی۔ میں سارا دن کیتھی کے فلیٹ میں اپنی اصلی حالت میں پڑا رہتا۔ سارا وقت یا تو سوزن کو خط لکھتا یا اس کے خط کا انتظار۔ علاج اور ڈاکٹر کے مشورے کے باوجود بھی زخم ٹھیک نہ ہوا اور تکلیف بھی بڑھ گئی۔ کل تو تکلیف میری برداشت سے باہر ہو گئی۔ کیتھی فوری طور پر مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ زخم دیکھ کر ڈاکٹر نے خاصی تشویش کا اظہار کیا اور مجھے تنبیہہ کی کہ اب مجھے ہمیشہ کے لئے کپڑوں سے دور رہنا ہوگا خاص طور پر پتلون سے کیونکہ پتلون سے میرا یہ زخم خراب ہوگا اور شاید جان لیوا بھی۔ یہ ایک بری خبر تھی۔ ادھر جب ہم فلیٹ پر واپس پہنچے تو سوزن کا ٹیلیگرام موجود تھا، وہ اگلے دن یعنی آج مجھ سے ملنے آ رہی تھی اس کا خیال تھا کہ ہم کرسمس کی چھٹیاں اکٹھے گزاریں گے۔ آہ میرے لیے یہ خبر کتنی اندوہ ناک ثابت ہوئی۔ فادر آپ اس کا

اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ میں رات بھر زخم کی تکلیف اور اس خبر کی وجہ سے جاگتا رہا۔ کچھ بھی سمجھ نہ آتا۔ پھر مجھے آپ کا خیال آیا کہ یقیناً آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ میں یہ تمام باتیں کسی کے ساتھ Share کرنا چاہتا تھا۔ کسی ایسے شخص کو بتانا چاہتا تھا جسے میری مجبوری کا یقین ہو۔ میرے ذہن میں دو باتوں کا خیال آیا۔ ایک آپ کا، ایک اپنی دنیا میں واپسی کا۔ کیونکہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

فادر نے ایک لمبا سانس لیا۔ میں تمھارے لیے کیا کر سکتا ہوں کہو؟ مجھے تمھاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔

بہت شکریہ فادر۔ اجنبی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ آج شام کو سوزن ڈریم لینڈ کیسینو (Casino) میں میرا انتظار کرے گی آپ اس تک میرا یہ خط اور اس کے خطوط کا بنڈل پہنچا دیں۔ اس نے برساتی کی جیب سے بنڈل نکال کر فادر جولیس کی طرف بڑھایا۔

لیکن میں کیسینو میں کیسے جاسکتا ہوں؟ فادر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

میں جانتا ہوں کہ آپ کا ایسی جگہ جانا مناسب نہیں لیکن آپ کو میری خاطر یہ سب کرنا ہوگا۔ سوزن کو میری مجبوری کا یقین دلانا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی باتوں پر وہ ضرور اعتبار کر لے گی...... فادر سوزن ایک اچھی لڑکی ہے۔

فادر جولیس نے دیکھا کہ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا تھا۔

اور تم کہاں جاؤ گے؟ فادر نے پوچھا

میں واپس اپنی دنیا میں اپنی دم کے ساتھ جانا چاہتا ہوں کہ یہ اب میری زندگی کے لئے محبت سے زیادہ ضروری ہے۔ مجھے نہیں رہنا آپ کی اس دنیا میں جہاں مجھے اپنے ادھورے وجود کے ساتھ محبت کے لئے Qualify کرنا پڑے......

فادر آپ بتائیں اگر میں رہنا بھی چاہوں تو کیا سوزن میری دم سمیت مجھ سے محبت کرے گی؟

فادر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ واقعی اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔

فادر آپ بس آج شام اس سے مل لیں۔ وہ ضرور آپ کی بات مان جائے گی اور مجھے معاف کر دے گی اور ہاں ایک کام اور بھی کریں۔ میرے لئے دعا کہ میں واپس جا کر خوش رہوں۔ میں ابھی جا کر یہ شائستگی کا لبادہ اتار کر پھینکوں گا اور پھر وہ زندگی بسر کروں گا جو میری اپنی ہے۔ میں بھی اپنی دم سے الٹا لٹک کر دنیا کو الٹا کر رکھ دوں گا۔ اس کا تمسخر اڑاؤں گا اور پھر پورا جبڑا کھول کر ہنسوں گا۔''Just Pray for me''

فادر نے مسکراتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے فادر جولیس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور سر پر ہیٹ رکھ کر تیز قدموں کے ساتھ چرچ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ فادر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر آیا۔ اس نے دیکھا بارش رک گئی تھی البتہ ہوا بہت تیز تھی۔ اس نے ایک آخری نظر دور جاتے ہوئے اجنبی پر ڈالی اور دروازہ بند کر لیا۔

گرین فورڈ کا انکل گوریو

جب میں پیدا ہوئی، انکل گوریو لندن جا چکے تھے اور پھر وہیں آباد ہو گئے۔ انکل سے میرا تعارف اُن خطوں سے ہوا جو ابا کے نام عموماً تصویروں سمیت آتے۔ یہ خط اور تصویریں انکل کے شب و روز کا دلفریب عکس ہوتے۔ مثلاً ایک تصویر میں ہیتھرو ایئرپورٹ کے کنٹرول ٹاور کے پس منظر میں اُس چھت کی منڈیر پر ٹیک لگائے کھڑے تھے جہاں لوگ جہازوں کی لینڈنگ اور ٹیک آف کا نظارہ کرتے ہیں۔ تصویر کی پشت پر لکھا تھا ''لنچ بریک میں ہوا خوری'' خط کے مطابق وہ کنٹرول ٹاور پر کمپیوٹر آپریٹر تھے۔ دوسری تصویر میں وہ بارکلے بنک سے نکلتے دکھائی دیئے اور تیسری تصویر ونڈمل لین پر اُن کے گھر کی تھی۔ اُن دنوں ابا اور انکل کی مراسلت زوروں پر تھی۔ ہر خط میں کسی نہ کسی واقعے کا بیان یا تصویری خبرنامہ ہوتا۔ ایسے ہی ایک خط میں بھیجی گئی ایک تصویر میں وہ ایلنگ ہاسپٹل کی پارکنگ لاٹ میں ڈریسنگ گاؤن پہنے مسکرا رہے تھے۔ نیلے رنگ کے اہرام نما تکونے گنبد اور منزل بہ منزل کھڑکیوں کی طویل قطاروں کے سامنے لی گئی یہ تصویر خط میں کی گئی وضاحت کے مطابق دو ماہ پہلے سکاٹ لینڈ کے سفر میں ایک خوفناک کار ایکسیڈنٹ سے صحت یابی کا ثبوت تھی۔ دوسری تصویر میں وہ ہاسپٹل بیڈ پر نیم دراز ایک خوبصورت نرس سے بلڈ پریشر چیک کرا رہے تھے۔ خط کے مطابق یہ نرس انکل کو اشاروں کناریوں میں شادی کا پیغام بھی دے چکی تھی۔ ابا نے یہ بات خط پڑھ کر اماں کو بتائی۔ اُس وقت میری عمر کوئی تین سال ہو گی اور اِدھر اُدھر کی سُن گُن لینے کی میری عادت پروان چڑھ رہی تھی۔ جونہی انکل کا کوئی خط آتا۔ میں تصویریں دیکھنے اور کسی نئے

کارنامے کا ذکر سننے کے لئے ابا اور امّاں کے درمیان جگہ بنا کر ڈٹ جاتی اور اگر امّاں ابا پہلے ہی چپک کر بیٹھتے تو میں اُن کے کندھوں پر جھک کر خط سنتی اور تصویریں دیکھتی۔

انہی دنوں اطلاع ملی انکل گوریو چار ہفتوں کے لیے وطن لوٹ رہے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی میرا چہرہ دمکنے لگا اور میں نے گھر گھر میں یہ بات پھیلا دی کہ میرے انکل جن کا خوفناک ایکسیڈنٹ ہوا تھا، لندن سے آ رہے ہیں۔ انکل کی خواہش پر استقبال کی زبردست تیاریاں کی گئیں۔ ریلوے اسٹیشن پر ابا کے بازو پر ٹکی میں استقبالیہ ہجوم کا گرین شاٹ نظارہ کرتے ہوئے خوشی سے لہلہا رہی تھی۔ انکل کو بینڈ باجے اور ٹھاٹھا پھٹتے گواوں کے جلوس میں گھر لایا گیا جہاں ایک بالائی کمرہ ان کے لیے آراستہ تھا مگر انکل نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ ایکسیڈنٹ کے بعد ڈاکٹر نے انہیں سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے منع کر رکھا ہے۔ تب انکل کو گراؤنڈ فلور پر میرا کمرہ دے دیا گیا جسے میرے ساتھ امّاں ابا کے علاوہ چھوٹی فرحت بھی شیئر کر رہی تھی۔

پچیس سال پہلے کی یہ ساری یادیں ایک کے بعد دوسرا منظر دکھاتی اس وقت میرے ساتھ ساتھ لندن کے لیے محو پرواز تھیں۔ دمشق ایئر پورٹ کا ٹرانزٹ تین گھنٹے کا تھا۔ لاؤنج کے ایک کونے میں بیٹھ کر کچھ دیر ورکشاپ کے لئے نوٹس کی تیاری کی اور پھر کافی کا مگ لے کر دوبارہ انکل گوریو کی سوچ میں کھو گئی۔ آج شام میں اور انکل پھر سے ایک ہی شہر میں ہوں گے۔ شاید وہ مجھے ایئر پورٹ بھی لینے آئیں یا مصروف ہوں تو بیٹے کو بھیج دیں۔ میں انھیں اطلاع دے چکی تھی۔

طیارہ ایک بار پھر چنگھاڑتا ہوا فضا میں بلند ہوا۔ اُس کا رُخ دوبارہ انگلستان کی طرف تھا۔

ایئر پورٹ پر مجھے کوئی بھی لینے نہیں آیا۔ سُبکی اور رنج کا احساس لئے میں نے فون کیا تو تا دیر صرف گھنٹی سنائی دی۔ کسی ناگہانی صورت حال کا اندازہ کئے میں نے ایئر پورٹ کے باہر ٹیکسی لی اور کہا ''ونڈمل لین۔۔۔ گرین فورڈ'' ٹیکسی جلد ہی موٹر وے سے اتر کر رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی۔ ایک دوسرے سے مشابہ وکٹورین طرز پر دو رویہ مکانوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم نے ونڈمل لین کی تختی عبور کی اور ایک سایہ دار ڈھلان اتر گئے۔ دنیائے اوّل کے اس داستانی

شہر میں اپنی موجودگی کا تفاخر اور انکل کی تلاش بے حد سنسنی خیز تھی۔۔۔ بتائے گئے بنگلہ نمبر پر ٹیکسی بائیں ہاتھ فٹ پاتھ سے لگ گئی جس کے بالمقابل ایک ذیلی سڑک کے آغاز پر لندن ٹرانسپورٹ کی سرخ ڈبل ڈیکر سکول کے بچوں کو اتار رہی تھی۔

''بس اسٹاپ کے سامنے رہنے کا بھی ایک اپنا مزہ ہے۔آپ تنہا محسوس نہیں کرتے''

دوران سفر کی طویل خاموشی کے بعد سامان اتارتے ہوئے کیپ ڈرائیور نے رسماً اظہارِ خیال کیا۔

یہ مکان میرے انکل کا ہے میں وزیٹر ہوں۔ بہرحال تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔''میں نے اخلاقاً جواب دیا۔اور ہینڈی اٹھائے ہوئے فرنٹ یارڈ میں داخل ہوگئی جہاں ملحقہ مکانوں کی شادابیوں کے برعکس ویرانیوں کے سائے تھے۔اکھڑے فرش پر کہیں کہیں سر نکالتی گھاس کی پتیاں اِدھر اُدھر بکھری بجری پر جنک سے بھرے کارٹن اور دودھ کے خالی کریٹ، نیچی چار دیواری کے اندر کیاریوں میں سوکھتے ہوئے پودے اور کونے میں کھڑا تنہا اور اداس صنوبر کا درخت۔۔۔فرنٹ ونڈو بس اسٹاپ کے رُخ تھی۔ میں نے اندر جھانکا۔ایک طرف سرکائے گئے پردے کے سامنے میز پر دھرا کمپیوٹر نظر آرہا تھا۔اس کے برابر داخلی دروازہ تھا۔میں اس کی بیل بجانے کو تھی کہ گھٹنوں تک سفید جرابیں اور نیلا سکول یونیفارم پہنے ایک نوعمر لڑکی نے پڑوس کے احاطے سے داخل ہوتے ہوئے مجھے پُکارا'' خان گھر میں نہیں ہے۔وہ چیک اپ کے لئے ہسپتال میں ہے۔

تمہیں کیسے معلوم؟ میں گھنٹی بھول کر اُس کی طرف چل دی۔

صبح سکول جاتے وقت میں نے خود ہیلتھ سروس والوں کو اُنہیں ایمبولینس میں لے جاتے دیکھا تھا۔میرے ساتھ سامان دیکھ کر جب اُسے معلوم ہوا کہ میں ائیر پورٹ سے آرہی ہوں تو اُس نے مجھے انکل کے انتظار تک اپنے گھر چلنے کی دعوت دے دی۔فرنٹ یارڈ کی بُرجی پر ایس نریندر لکھا دیکھ کر اندازہ ہوا کہ پڑوسی ہندوستانی سردار ہیں۔لیونگ روم میں داخل ہوتے ہی لڑکی نے جوتے اتارے۔میں نے بھی اتار دیئے۔پھر اوپر جاتے زینے کے پاس سکول بیگ ڈال کر صوفے پر اوندھے لیٹے چھوٹے بھائی کی کمر پر دھپ لگا کر کہا......''ہائے بلّی''لڑکا غصے میں

پلٹا لیکن مجھے دیکھ کر چپ ہو گیا۔

باہمی تعارف کے بعد سب لوگ سہ پہر کی چائے کے لئے ٹیبل پر جمع ہوئے۔ نریندر جی جاب سے لوٹے تھے اور بڑی بیٹی جولی جا رہی تھی۔ تنگ ٹراؤزر پر چمڑے کی جیکٹ پہنے گوگو لگائے وہ بالائی منزل سے تیز تیز سیڑھیاں اتر کر چائے کے لیے آئی تو میرا تعارف کرایا گیا۔ وہ جلدی میں لگ رہی تھی۔

''آئی ایم جولی'' اُس نے ہلکا سا آگے جھک کر نام بتایا۔ مجھے وہ ہالی وڈ کی کوئی نو وارد ایکٹریس لگی۔

''یو آر مورڈین جولی۔ یو آر جولیا رابرٹس۔''

اس تعریفی جملے پر وہ ہنس دی۔ کھڑے کھڑے ہائی ہیل پہنی، بیگ اٹھایا اور ہیلو کی طرح انگلیاں نچا کر ''سی یو لیٹر'' کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔

نریندر جی نے بتایا کہ دو ماہ پہلے ہی اس کی شادی کی ہے۔ اُس کا میاں فائر فائٹر ہے۔ جُولی میکڈونلڈ میں کام کرتی تھی جہاں آگ لگی، فائر بریگیڈ میں شامل رِشی نے فائر فائٹنگ سے فارغ ہوتے ہی اُسے پرو پوز کر دیا۔ ہم بھی مان گئے۔

جولی کا دل کش سراپا ابھی بھی میرے سامنے تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اُس کی خاطر کہیں بھی آگ لگائی اور بجھائی جا سکتی تھی۔

مسٹر اینڈ مسز نریندر بڑے صاف گو لگے، وہ طویل عرصہ سے انکل گوریو کے پڑوسی تھے اور پڑوسی ہونے کے ناطے آپس کا آنا جانا بھی تھا۔ جب میں نے ائیر پورٹ پر انکل یا اُس کے کسی بیٹے کے نہ آنے کا ذکر کیا تو نریندر بولے'' پر آتا کون؟ خان چل نہیں سکتا اور بیٹا کوئی ساتھ رہتا نہیں۔ بیس سال سے یونہی اکیلا سوشل سکیورٹی پر جی رہا ہے۔ بیوی پانچ سال بعد ہی تینوں بیٹے لے کر الگ ہو گئی۔ بیٹے اب جوان ہیں مگر بیویوں کے ساتھ موج مستی میں باپ کو پوچھنے تک نہیں آتے۔ اُس کے کئی آپریشن ہو گئے۔ میں اور تیری ماسی (مسز نریندر) حال احوال پوچھنے ہسپتال

جایا کرتے تھے مگر خان کے کسی بیٹے کو ہم نے ہسپتال آتے جاتے نہیں دیکھا...... آج صبح بھی سوشل سکیورٹی والوں کی ایمبولینس پر ہسپتال گیا ہے۔ وہی چھوڑ جائیں گے...... بڑا دکھی ہے بیچارہ......

انکل گوریو کے بارے نریندر جی کے افسوسناک انکشافات سُن کر میرا دل ایک دم بجھ گیا۔ آنٹی کی علیحدگی کا تو مجھے علم تھا مگر بیٹوں کے بارے میں تو یہی لکھتے رہے کہ اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔

پر باپ تو پھر بھی باپ ہی ہوتا ہے جی۔ نریندر نے مزید بتایا۔ خان کا اپنا خرچہ تو سرکاری گرانٹ سے کہیں کم ہے۔ کھانا پینا بھی بس واجبی ہے۔ مگر جوڑ جمع کا بڑا شوقین ہے۔ اوّل تو کوئی نہ کوئی بیٹا چار چھ مہینے بعد جمع پونجی سے پیسے ہتھیانے خود ہی آ جاتا ہے۔ اگر نہ آئے تو خان ٹیلیفون کر کے آپ بلا لیتا ہے کہ بیٹا ذرا اچھے ماڈل کی کار لو...... یہ لو تین سو پونڈ...... اسی طرح عید شبرات پر کہیں آ ٹپکیں تو سو پونڈ دے ڈالتا ہے...... ایک دو بار تو اُن کی گاڑیوں کے چالان چٹ کا جرمانہ بھی خان ہی نے بھرا اور صرف اتنا کہا ''گڈی دیکھ کے چلایا کرو'' سارے بیٹے چنگا بھلا کما رہے ہیں بڑا ٹیکسی سروس کر رہا ہے۔ درمیانہ کسی سٹور میں لگا ہے اور چھوٹا کمپیوٹر سیل میں ہے۔ پھر بھی اُڑی تُڑی کا بوجھ باپ پر ڈال دیتے ہیں۔

تینوں بیٹوں کے روزگار اور کارہائے نمایاں کی تفصیل سن کر میں نے نریندر جی کی بات کاٹی۔ مگر انکل کا بڑا بیٹا تو پائلٹ بن رہا ہے صرف پندرہ سبق باقی ہیں۔ خطوں میں تو یہی لکھا کرتے ہیں۔

نریندر چائے کی پیالی ہونٹوں سے اتار کر ایک دم ہنس پڑے...... یہ پندرہ سبق پچھلے تین سال سے باقی ہیں...... خان بڑا گپوڑی ہے...... ہر ایک کو یہی کہتا ہے۔ پچھلی عید پر میں اُسے مبارک باد دینے گیا تو بڑا بیٹا موجود تھا۔ میں نے پوچھا، سنائیں جناب! تمہارے پائلٹ کا کورس کتنا باقی ہے؟ بیٹا تو یہ سُن کر باہر کھِسک گیا البتہ خان نے بتایا کہ صرف پندرہ سبق باقی رہ گئے ہیں۔ بعد میں بیٹا مجھے ملا تو کہنے لگا ''نریندر انکل۔ میرے ڈیڈی کو بولو۔ میرے پائلٹ بننے کی

کہانی سنانا چھوڑ دیں۔ میں کوئی پائلٹ وائلٹ نہیں بن رہا۔ ٹیکسی سروس میں خاصا کما رہا ہوں......

چائے ختم کر کے نریندر جی نے مزید بتایا کہ انکل رائٹر بھی ہیں اور لوکل ٹرانسمشن کے سن رائز ریڈیو پر اکثر اپنی کویتا سنایا کرتے ہیں۔ ''بڑا پرانا لکھاری ہے۔ کہتا تھا یہاں آنے سے پہلے وطن میں بھی فلم کی کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ خان کی کویتا مجھے زیادہ سمجھ میں نہیں آتی، اتنا پتہ ہے کہ پیار اور وچھوڑے کی باتیں ہوتی ہیں......لگتا ہے۔ بھرجائی کو ابھی تک نہیں بھولا۔

مسز نریندر برتن سمیٹ رہی تھیں۔ انکل کی بیوی کا سُن کر بولیں۔ میں نے بھا جی کو دوسری شادی کا کئی بار کہا لیکن وہ مانتے ہی نہیں تھے۔ کہتے کہ نہیں بہن جی میرے بچے رُل جائیں گے۔ میں نے کہا بھائیا! بچے تو اپنی ماں کے پاس ہیں۔ کیسے رُل جائیں گے۔ سُن کر چُپ ہو گیا۔ اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ ٹانگیں جواب دے گئیں مگر جب بھی ملو کسی ائیر ہوسٹس کبھی کسی نرس کے بارے کہتا ہے کہ شادی پر مجبور کر رہی ہیں۔ میں کہتی ہوں کر لو پھر......کہتا ہے نہیں بہن جی میرے بچے رُل جائیں گے۔

بلّی باہر سے آیا تو اطلاع دی کہ انکل گوریو ابھی ابھی ایمبولینس پر گھر پہنچے ہیں۔ میں جانے لگی تو نریندر بولے ''گھنٹی بجا کر انتظار کرنا۔ دروازے تک پہنچنے میں خان کو پانچ دس منٹ لگ جاتے ہیں۔ کھڑکی میں بیٹھا ہو تو ملاقاتی دیکھ کر اگلا دروازہ کھولتا ہے۔ اگر بستر میں ہو تو پچھلا۔ جانے سے پہلے فون کر لو تو سب سے بہتر......ٹھہرو تمہارے بارے اُسے فون کر کے بتاتا ہوں۔''

فون ہو چکا تو نریندر بولے ''پچھلے دروازے سے جانا......خان بیڈروم میں ہے۔''

ہینڈی اٹھائے راہداری سے گزرتی پچھواڑے پہنچی جہاں بیک گارڈن کی بجائے جنک یارڈ کا سماں تھا۔ سالوں پہلے بیکار سمجھ کر پھینکا گیا گھریلو سامان بارش اور برف کے تھپیڑے سہتا شکستہ اور بے رنگ ہو چکا تھا۔ بھوری گھاس آوارہ پتوں سے اٹی ہوئی تھی اور چوبی باڑھ کی پھٹیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ چکی تھیں۔ نریندر کی باتوں کے بعد خانہ ویرانی کے اس منظر نے مجھے مزید ڈیپریس کر دیا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر میں پلٹی تو انکل گوریو میرے روبرو تھے۔ پہلے سے کہیں

مختلف، بوڑھے اور چھڑی پر جھکے ہوئے۔ بچپن کی پونی ٹیل گڑیا کو برسوں بعد اپنے سامنے دیکھا تو امڈتے آنسوؤں کے ساتھ مجھ سے لپٹ گئے۔ سہارا دے کر میں اُنہیں بیڈ تک لے آئی، پھر سامان اٹھایا اور کرسی گھسیٹ کر روبرو بیٹھ گئی۔ انکل آنسو پونچھ رہے تھے۔

''تم اتنی بڑی ہو گئیں۔ بغیر بتائے چلی آتیں تو شاید میں پہچان بھی نہ سکتا۔''

اور بتانے پر بھی کون سا آپ مجھے ایئرپورٹ پر لینے آ گئے......فون کیا، تو بھی نور پلائی۔''

دراصل ہوا یہ کہ اُنہوں نے بمشکل ہاتھوں کے بل سیدھا ہو کر ٹیک لگائی۔ ہوا یہ کہ آج میرے میڈیکل چیک اپ کی ڈیٹ تھی اور مجھے یاد بھی نہیں تھا۔ میں ایئرپورٹ کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ بڑے بیٹے نے فون کیا ڈیڈی میں آ رہا ہوں، آج آپ کا چیک اپ ہے۔ وہ مجھے ہسپتال لے گیا۔ وہاں سے سیدھا فلائنگ کلب بھاگا جہاں اس کی پہلی سولو فلائٹ تھی۔ میں ہسپتال جاتے آنسرنگ مشین آن کرنا بھول گیا، نہیں تو میرے ہسپتال جانے کا پتہ چل جاتا۔ بیٹا کلب سے فارغ ہو کر ہسپتال آیا اور تمہارے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے مجھے گھر چھوڑ کر گیا ہے۔ میں ہیومن رائٹ کمیشن والے ہوٹل فون کر کے تمہارے بارے پوچھنے ہی لگا تھا کہ نریندر کا فون آ گیا تم ان کے ہاں بیٹھی ہو۔''

انکل سانس لینے کو رکے تو میں نے کہا وہاں بھی آپ ہی کا تذکرہ رہا۔

انکل چونکے، کوئی اُلٹی سیدھی تو نہیں ہانک دی۔ میں ان سے کم ہی ملتا ہوں۔ تم کتنے دن یہاں رہو گی؟

ایک ہفتہ۔ خاصی مصروفیت رہے گی۔ ڈیلی گیٹس کے ساتھ ہوٹل میں ٹھہرنا لازمی ہے، پتہ نہیں کہاں کہاں جانا ہو۔

لندن آ کر انکل سے دور رہنے پر مجھے بے حد افسوس تھا۔ بہر حال آج رات تو ادھر ہی ہوں۔

ٹھیک ہے، کل بیٹا تمہیں ہوٹل چھوڑ آئے گا۔

مجھے خیال آیا وہی حاضر غائب بیٹا جو تھوڑی دیر پہلے انہیں ہسپتال سے لایا تھا۔

انکل مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر نہال ہو رہے تھے۔ میری جاب اور انٹرنیشنل کنونشن میں نمائندگی کے اعزاز پر وہ بے حد مسرور دکھائی دیئے۔ گھر کے احوال کے بعد ابا کا پوچھا تو میں نے کہا'' آج کل عیش کر رہے ہیں۔

''یعنی''

مطلب یہ کہ وکالت سے دستبردار ہو کر کبھی بیٹے کے پاس امریکہ، کبھی دوستوں سے ملنے دہلی اور بومبے، گھر میں ہوں تو اماں سے چخ چخ۔

''اُسے کہو سُدھر جائے'' انکل نے پیغام دیا اور زور سے ہنسے۔

اچھا کسی دن تمہیں یہاں فیملی ڈنر پر ضرور آنا پڑے گا۔ یہ پروگرام میرے سے زیادہ میرے بچوں کا ہے۔ کاؤنٹی والے گھر کی مرمت کرنے والے ہیں اس لیے وہ ماں کے ہاں شفٹ ہو گئے۔ اگر تم پچھلے ہفتے آتیں تو بڑی رونق تھی۔ سب یہیں تھے۔ مرمت ختم ہوگی تو پھر آ جائیں گے۔

انکل بڑے اعتماد کے ساتھ مجھ سے محو کلام تھے اور میں ساتھ ساتھ سوچ رہی تھی کہ ان کی کون سی بات سچ تسلیم کروں۔ ہسپتال تو آج بیشک گئے مگر آنا جانا سرکاری ایمبولینس پر ہوا جس کا سہرا انکل نے پائلٹ بیٹے کے سر باندھ دیا۔ اب مجھے ہوٹل پہنچانے اور فیملی ڈنر پر آنے کے لیے بھی انہی کا حوالہ دے رہے تھے جو وہاں موجود ہی نہ تھے۔

نریندر جی کی بات شاید درست ہو...... ''خان بڑا گپوڑی ہے۔''

انکل چائے بنانے کے لئے کچن میں گئے تو میں نے گھر کا جائزہ لیا۔ بالائی کمرے سنسان پڑے تھے۔ نیچے بیڈروم سے ملحقہ ملاقاتی کمرہ (ڈرائینگ روم) سڑک کے رخ تھا جس کے وسیع دریچے کے بالکل مقابل بس اسٹاپ کی ہمہ وقت رونق انکل کی تنہائیوں کو آباد رکھتی تھی۔ اِدھر اُدھر پڑا مختصر سامان بیچلر بے ترتیبی کا شکار تھا۔ مجھے کسی طور یوں نہیں لگا کہ چند دن پہلے تک یہاں انکل کے بیٹے رہائش پذیر تھے۔

چائے ہم نے دریچے کے روبرو انکل کی مستقل نشست گاہ میں پی۔ رات گئے ہوٹل

سے ڈنر کا ہوم ڈلیوری پیک منگوایا گیا۔ کھانے کے دوران بیٹوں کی سعادت مندی اور خدمت گزاری کے تذکرے سرفہرست رہے اور یوں نریندر جی نے جو کچھ مجھے بتایا، اُس کی تردید ہونے پر مجھے اطمینان ہوا۔ بڑے بیٹے کو عنقریب پائلٹ لائسنس ملنے کا ذکر جاری تھا کہ میں نے انکل اور بیٹوں کے لئے لائے گئے تحفوں کے پیکٹ میز پر رکھ دیے جنھیں رسمی تکلف کے ساتھ قبول کرتے ہوئے انھوں نے یہ تحفے بیٹوں کو بھجوانے کا وعدہ کیا۔

چائے کا دوسرا دور چلا تو میں نے انکل سے شادی کی بات چھیڑ دی۔ پتہ چلا کہ اس محاذ پر انھوں نے بہت سی حسیناؤں کے دل توڑ رکھے ہیں۔ ایلنگ ہسپتال کی نرس سے ہوتے ہوئے ایئر ہوسٹس پر رُکے اور پھر ڈاکٹر شائستہ کا تذکرہ چھیڑ دیا جس سے کورٹ شپ تو بہت چلی مگر شادی سے یہ کہہ کر انکاری ہو گئے کہ میرے بچے رُل جائیں گے۔ پھر تازہ ترین انکشاف کرتے ہوئے کہا۔

آج کل سن رائز ریڈیو پر میری شاعری سن کر بہت سی لڑکیاں میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں، ریڈیو والوں سے فون نمبر پوچھتی ہیں۔ ایک تماشا یہ بھی ہوا کہ تمہاری آنٹی نے میری غزلیں سُن کر سَن رائز فون کیا کہ جب خان نے مجھے چھوڑ ہی دیا ہے تو اب شاعری کے پردے میں میرا ذکر کیوں کرتا ہے۔ ریڈیو والوں نے جواب دیا۔ بی بی...... خان ہمارا اسٹار پوئٹ ہے۔ جب اس کی شاعری براڈ کاسٹ ہو رہی ہو تو ریڈیو آف کر دیا کرو۔ ریڈیو کے اس ترکی بہ ترکی جواب پر انکل کھلکھلا کر ہنسے تو اخلاقاً میں بھی ہنس دی۔

سفر کی تکان اور باقی پھر سہی کے خیال سے میں نے کئی بار گفتگو کو اختتامی موڑ دیا مگر انکل ایک کے بعد دوسرے واقعے کا بیان اتنے پُر اسرار انداز میں کرتے کہ مجھے ہمہ تن گوش ہونا پڑتا۔ نصف شب کی آخری ڈبل ڈیکر دریچے کے سامنے سے گزری تو جلسہ برخاست ہوا اور انکل نے صوفے پر دراز ہوتے ہوئے اپنا کمرہ میرے حوالے کر دیا۔

اجنبی جگہوں پر نیند نہ آنا میری پرانی عادت ہے۔ اس رات بھی یہی ہوا اور میں تا دیر انکل کی داستان گوئی کا تجزیہ کرتی رہی۔ وہ عام بچوں کے برعکس کچھ جسمانی محرومیاں لے کر پیدا

ہوئے تھے جس کی تلافی کے لئے پہلے لندن کی انسان دوست اور پرکشش فضا اختیار کی، پھر زندگی کے خاموش طنز سے آنکھیں چرا کر ایک خیالی دنیا میں آباد ہو گئے۔ گرد و پیش کے رزمرہ حقائق کی ڈرامائی تشکیل میں اپنا کردار انتہائی نمایاں اور سنسنی خیز طریقے سے ادا کرتے اور جب وہ اپنے یوٹوپیا کے حصار میں کھڑے ہو کر کوئی بلیٹن جاری کرتے تو سننے والوں کی سٹی گم ہو جانے کی انہیں بالکل پرواہ نہ ہوتی۔ ایسے کئی بلیٹن میں بچپن میں سن چکی تھی، جب وہ پہلی مرتبہ وطن لوٹے میرا زیادہ وقت انہی کے پاس گزرتا۔ ابا بھی فرصت کو اٹھائے اکثر وہیں آ جاتے۔ وہ سرکاری وکیل تھے اور حسبِ عادت انکل کی باتوں میں شک کا فائدہ ڈھونڈتے رہتے۔ دوران گفتگو ابا کی قطع کلامی اور اختلاف رائے انکل کو سخت ناپسند تھا اور ایسے ہی کسی موقع پر اُنہوں نے ایک دن ابا کو تقریباً ڈانٹ دیا اور کہا ''دیکھو بھائی جان، میں انگلینڈ ریٹرنڈ ہوں، آپ میری نالج سے نہ ٹکرایا کریں۔'' تب سے ابا چوکنے ہو گئے لیکن میں انکل کی باتیں نہایت دلچسپی سے سنتی اور اتفاق رائے کا اظہار کرتی۔ گو میری عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ باتوں کے دوران صرف ہوں ہاں کرتی رہتی اور اکثر اونگھتے اونگھتے لڑھک جاتی حالانکہ انکل کی باتیں بے حد سنسنی خیز اور نیند اڑا دینے والی ہوتیں۔ مثلاً ایک واقعہ انہوں نے سکول فٹ بال ٹیم کی پاکستان کے دنوں کا سنایا کہ کس طرح اکیلے ہی اُنہوں نے مخالف ٹیم پر لگاتار دس گول کیے اور میچ ختم ہونے سے کچھ دیر پہلے فٹ بال کو اتنی زوردار کک لگائی کہ تماشائیوں کی گردنیں اوپر اٹھ گئیں۔ بال گراؤنڈ سے باہر کھیتوں کی طرف جاتا نظر آیا اور آج تک نہیں ملا۔

میں خوشی کے مارے تالی بجانے کو تھی کہ انکل نے ایک افسوسناک واقعہ کا اضافہ کیا۔ میچ کے کچھ ہی دنوں بعد موٹر سائیکل سے گرنے پر ان کے دائیں کولہے کا فریکچر ہو گیا۔ غلط اپریشن سے ٹانگ کی لمبائی ایک انچ کم ہو گئی جو کئی سال بعد لندن کے ڈاکٹر بریڈک نے دوبارہ اپریشن کے بعد جوتے کی ایڑی ایک انچ زیادہ کر کے پوری کی۔

ابا اب تک دس گول اور فٹ بال غائب ہونے پر ششدر تھے جیسا کہ میں نے ان کے

چہرے سے اندازہ کیا۔ لیکن میں انکل کے موٹر سائیکل ایکسیڈنٹ پر سر جھکائے صدمہ میں تھی۔
انکل نے ہم دونوں کو خاموش پایا تو بات آگے بڑھائی۔ ''یوں فٹ بال سے میرا رابطہ ختم ہو گیا اور میں نے سپورٹس کی توانائیاں مطالعے اور لکھنے لکھانے پر صرف کرنا شروع کر دیں۔ بہت سے افسانے لکھے، کئی فلمی کہانیاں اور ان کے نغمے تحریر کئے۔ لیکن فلمی لوگ اکثر بد دیانت ہوتے ہیں، فلم تو میری ہی کہانی اور نغموں پر بناتے مگر ٹائٹلز پر میرے نام سے ملتے جلتے کسی فلمی مصنف کا نام دیا جاتا۔ میں اس دھوکہ دہی پر پولیس کیس کرنے ہی والا تھا کہ لندن جانے کا پروگرام بن گیا۔

انکل کی ہزار داستان میں سے اب لندن کا کوئی واقعہ رونما ہونے کو تھا کہ مجھے اونگھ آنے لگی۔ انہوں نے تکیے کے نیچے سے کیڈ بری چاکلیٹ پیک نکالا اور میرے کندھے پر دستک دے کر کہا ''ہلو اسپیشل چائلڈ، آنکھیں کھولو۔ چاکلیٹ کھاؤ۔'' تب اس طرح احترام سے مخاطب کرنے اور چاکلیٹ کی پیشکش پر میں تادیر جاگتی اور چاکلیٹ کھاتی رہی۔ اس دوران انکل نے مجھے لندن لائف کے بہت سے واقعات سنائے۔ پہلا واقعہ ہی ایکسیڈنٹ کا تھا۔ سیف وے سے گراسری لے کر نکلے تو فٹ پاتھ پر جمی برف پر پھسل گئے۔ کولہے کی ہڈی اپریشن کے بعد دوبارہ اپنی جگہ جمانا پڑی۔

اوہو! چاکلیٹ کی رال بمشکل سنبھالتے ہوئے میرے منہ سے نکل گیا۔

انکل یہ آپ کے اتنے ایکسیڈنٹ کیوں ہوتے ہیں؟ میرے لہجے میں بچپن کی حیرت اور سادگی تھی۔

ایکسیڈنٹ کا کیا ہے۔ انکل بولے ''کبھی بھی ہو سکتا ہے۔ ہم خود تھوڑا ہی کرتے ہیں۔ اپنے آپ ہو جاتا ہے۔ اس ایکسیڈنٹ کی ایک بات اور...... شاید تمہیں یقین نہ آئے۔

وہ کون سی؟ میں یقین کر لینے پر تیار بیٹھی تھی

ہوا یہ کہ اپریشن کے دوران میرا دل بند ہو گیا۔ ڈاکٹروں کے مطابق میڈیکل ہسٹری میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا۔ اپریشن چھوڑ، پتہ نہیں کون کون سی مشینیں لا کر دل کو دوبارہ چلایا۔ سمجھو کہ مر کر دوبارہ زندہ ہوا۔

ایک کے بعد دوسرا ایکسیڈنٹ، اور پھر اپریشن، اور دل کا بند ہونا، اور مر کر زندہ ہونا، ایسے خوفناک بلیٹن سن کر میں نے انکل سے کہا تھا کہ مجھے ایکسیڈنٹ والی باتیں نہ بتایا کریں۔ تب اُنہوں نے بڑے پیار سے میرے بالوں کو ماتھے سے اوپر سمیٹ کر کہا۔''او کے۔نہیں بتاؤں گا۔

انکل کے ہاتھ ہٹاتے ہی میں نے انگلیوں کی کنگھی سے بال دوبارہ ماتھے پر گرا کر پہلے کی طرح اپنا پسندیدہ سٹائل بنالیا۔

پتہ نہیں کب نیند آئی۔ آنکھ کھلی تو کچن کے واش بیسن میں پانی گرنے اور برتن دھونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انکل گھر گرہستی میں لگے تھے۔ دو چار جمائیاں لے کر میں مدد کو پہنچی تو وہ ٹی پاٹ میں چائے انڈیل رہے تھے۔ پاؤں گھسیٹ کر ہلکے قدموں چلتے انکل بے کسی کا قابلِ رحم نظارہ تھے۔

''گڈ مارننگ''لندن کی پہلی صبح کے آغاز پر میرے پہلے الفاظ''

اُنہوں نے ٹوسٹر پلگ کیا۔ میں باقی کام خود نپٹانے کے لئے آگے بڑھی تو بولے برسوں بعد ہاتھ پیر ہلانے کا موقعہ ملا ہے، ذرا ایکسرسائز ہونے دو۔ اگلے مہینے بچوں نے آ کر کام سنبھال لیا تو پھر سے کاہل ہو جاؤں گا...... چلو تم، میں ناشتہ لا رہا ہوں۔''واش روم سے لوٹی تو انکل ریسیور ہاتھ میں لئے منہ لٹکائے کھڑے تھے، مجھے دیکھتے ہی کہا تینوں میں سے کوئی بھی گھر نہیں ملا...... بہر حال میں نے ہوٹل پہنچانے کے لئے پیغام ریکارڈ کرا دیئے ہیں۔ جس کو پہلے پتہ چلا دوڑتا چلا آئے گا۔

چھوڑیں انکل۔ میں ٹیکسی کر لوں گی۔ میں نے ریسیور لے کر فون رکھ دیا۔

ناشتہ ہوا، لنچ ہوا، ڈنر ہوا اور ڈھیروں باتیں ہوئیں...... میرے لئے کوئی بھی نہ آیا۔ میں نے واپسی سے پہلے فیملی ڈنر پر آنے کا وعدہ کیا اور رخصت لی۔ فٹ پاتھ پر کھڑی ٹیکسی کا انتظار کر رہی تھی کہ جولی نریندر باہر نکلی۔ گذشتہ شام کی طرح حشر بداماں...... مجھے دیکھ کر ہاتھ لہرایا، یارڈ سے گاڑی نکالی اور چیختے ٹائروں سے موڑ کاٹتی ہوئی یہ جا، وہ جا۔ دل نے کہا آج پھر کہیں آگ

لگے گی۔

ہوٹل پہنچی تو مجھ سے پہلے آنے والی انڈین ڈیلی گیٹ پدما جوشی کو اپنا روم میٹ پایا۔ ہنس مکھ اور سنگیت رسیا پدما سے میری خوب جمی۔ سیمینار عموماً سہ پہر تک چلتے۔ آخری تقریر ختم ہوتے ہی ہم تیر کی طرح ہوٹل سے نکلتیں، پہلی بس یا ٹیوب پکڑ کر کسی جگہ اترتیں اور بلائینڈ واک کرتے کہیں کی کہیں جا پہنچتیں۔ ایسی ہی تراپڑ تراپڑ سیاحت میں بی بی سی کے بش ہاؤس جا نکلیں۔ تعارف سنتے ہی سینئر براڈ کاسٹر یاور عباس صاحب نے سٹوڈیو اور دفتر کا معائنہ کرایا اور کینٹین میں چائے بھی پلائی۔ باہر نکل کر ہم دونوں نے انگریزی رواج کے مطابق ایک دوسری کو ''گڈ ٹائم پاس'' کے ٹھینگے دکھائے۔

ایسے ہی بگ بین اور پارلیمنٹ ہاؤس کی مٹر گشت کے بعد شوقِ آوارگی ٹیمز کے ساتھ ساتھ بہتا ایک روز ہمیں ٹاور برج تک لے گیا۔ ریلنگ پر جھکے ایک بوڑھے انگریز نے پل کے پار ایک قلعہ نما پتھریلی عمارت کی طرف انگلی اٹھائی۔ ''اس کی تصویر ضرور لینا۔''

پدما نے پوچھا ''اس میں ایسی کیا خوبی ہے؟''

بوڑھا بولا ''اس میں ہنری ہشتم اپنی چھ بیگمات سمیت رہ چکا ہے۔''

اس تاریخی انکشاف پر پدما نے گلے سے لٹکتا کیمرہ آنکھوں سے لگا کر ایک تصویر کلک کی اور پوچھا ''عیسائی مذہب میں تو صرف ایک شادی کی اجازت ہے۔''

مگر ہنری ہشتم کے لئے نہیں۔'' بوڑھے نے دوٹوک جواب دیا۔

''وہ کیسے'' میں نے پوچھا

آسمانی حقِ بادشاہت کے تحت مذہبی رکاوٹ دور کرنے کے لئے ہنری نے چرچ کی سربراہی بھی خود ہی سنبھال لی تھی......اور یہی واحد حل تھا۔

ہم نے ہنری ہشتم کی ذہانت کو سراہا اور فوکس میں بوڑھا اور عمارت دونوں لے کر ایک اور تصویر اتاری۔

بھانت بھانت بولیوں کے شہر میں ایک دن جب ہم آپس میں باتیں کر رہی تھیں، پدما نے کہا تمہاری اور میری بھاشا تو ایک ہی ہے۔ پھر تم اردو اور میں ہندی کیوں کہتی ہوں؟

بالکل اسی طرح، میں نے مثال دی۔ ''جیسے امریکہ والے انگریزی بولنے کے باوجود بضد ہیں کہ ان کی زبان کو انگریزی کی بجائے امیریکن کہا جائے۔

''وٹ نان سینس'' وہ برہمی سے بولی، اس طرح تو برطانوی شیکسپئر کی تمام شاعری امریکی زبان میں ہوئی۔

یونہی سمجھ لو......اور اسی حساب سے غالب نے بھی ہندی زبان میں شاعری کی۔ میں نے جواباً کہا۔

دِس از سٹوپڈ......مگر بھائی ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس نے افسردگی سے کہا۔

ہوٹل کے سیمینار ہال میں دنیا بھر کے نمائندے پورے پانچ دن اس ایک نکاتی ایجنڈا پر تقریریں کرتے رہے کہ آج کے گلوبل ولیج میں انسان کے بنیادی حقوق کی تلفی کسی طرح ختم کی جائے۔ ہر روز کی طرح تقریروں کے دوران بھی کئی ملکوں میں جنگ کے خلاف اور امن کے حق میں بولتے ہوئے دنیا میں آنے والے ہر فرد کے لئے زندگی کا تحفظ، آزادی، انصاف، تعلیم، صحت اور رہائش جیسے بنیادی حقوق پر زور دے رہے تھے۔ سبھی تقریریں اور حوالے ایک جیسے تھے۔ میں نے اور پدما نے بھی ایسے ہی ٹسوے بہائے۔

آخری اجلاس سہ پہر کو رکھا گیا جس میں ریزولیوشن پاس ہوا کہ بنیادی حقوق کی بازیافت اور نفاذ کے لئے انسانی حقوق کمشن اور اقوام متحدہ فوری اقدامات کرے۔ سب نے ہاتھ اٹھا کر منظوری دی اور ڈیسک بجائے۔ ریزولیوشن کی ایک نقل جنیوا اور ایک نیویارک بھیجی گئی اور یوں ویک اینڈ کی شام سرمئی ہونے سے پہلے پہلے کنونشن اختتام کو پہنچا۔ ڈیلی گیٹس ٹولیوں میں بٹے، گپیں اور قہقہے لگاتے، ایک دوسرے کا ایڈریس لیتے اور پھر سے ملنے کے وعدوں پر ہال سے

رخصت ہوکر اپنی اپنی چوائس کا ''گڈ ٹائم'' منانے سنٹرل لندن کی طرف روانہ ہوئے۔

اُس رات پکیڈلی اور سوہو کی رونقیں دیکھنے لائق تھیں۔

اختتام ہفتہ کے یہ دو دن پدما اور میں نے بلائنڈ واک کی بجائے باقاعدہ سیاحت کی۔ ونڈسر کاسل اور مادام تساد کے مومی عجائب گھر کو دیکھا۔ بگ بین اور ملکہ کے محل کے گرد چکر کاٹے۔ 10 ڈاؤننگ سٹریٹ کے سامنے سے گزریں۔ ٹرایفالگر سکوائر پر کبوتروں کو دانہ کھلایا اور آخری شام لیڈی ڈیانا پر باتیں کرتے کرتے ہائیڈ پارک کے سپیکرز کارنر پہنچیں۔ ڈیانا کے ازدواجی حقوق کی پامالی پر ہم دونوں سخت غصے میں تھیں۔ لہٰذا انسانی حقوق کی انٹرنیشنل ڈیلیگیٹ ہونے کے ناطے ہم نے عالمی شہرت کے اس فورم پر سامعین کی عدم موجودگی کے باوجود ایک دوسری کے سامنے تقریریں کیں اور داد پائی۔ جنگلے کے قریب ٹوٹے پھوٹے چوبی کارٹن پر کھڑے ہوکر ڈیانا سے بے وفائی پر پہلے میں نے پرنس چارلس کے لتے لئے، جس پر پدما نے زوردار تالیاں بجائیں۔ پھر پدما کی باری آئی اور اس نے ڈیانا کے اصطبل انچارج اور رائیڈنگ ٹریز جیمز ہیوٹ کی کرتوتوں کا بھانڈا پھوڑا جس کی میں داد دیے بغیر رہ نہ سکی۔ آخر میں ہم دونوں نے ہائیڈ پارک کی جھیل کے پار ڈیانا کی تنہائیوں سے سنسناتے کینزنگٹن پیلس کی طرف رخ کر کے ہاتھ اٹھائے اور پدما نہایت رقت بھری آواز میں معصوم صورت مرحومہ کی المناک موت پر اُس کی بے چین روح کی شانتی کے لئے دعا کی۔

ہوٹل کا قیام ختم ہو رہا تھا۔ میں نے انکل کو فون پر بتایا کہ فیملی ڈنر کے لئے کل آ رہی ہوں۔ جواب ملا کے بڑے بیٹے کی بیگم کی پھوپھی صاحبہ انتقال فرما گئی ہیں، سبھی لوگ مانچسٹر چلے گئے۔ ''بہرحال ہم لنچ پر تو مل ہی سکتے ہیں۔'' انکل نے یہ کہتے ہوئے گویا مجھے سبکی کے احساس سے نجات دلا دی۔ میں نے بھی ان کی دل جوئی کے لئے لنچ پر آنے کا وعدہ کر لیا اور ائر لائن کے دفتر فون پر لنچ کی شام واپسی کے لئے سیٹ کنفرم کرا لی۔ پدما بھی اُسی شام واپس جا رہی تھی۔

لندن کی آخری رات

گھر واپسی کی خوشی میں پدما آئینے کے سامنے کھڑی ایک گیت گنگنا رہی ہے ''پیا تو

سے نیناں لاگے رے۔"

یہ "فلم گائیڈ کا گیت ہے" میں نے اشارہ دیا۔

"ہاں......وحیدہ دیدی نے اس پر نرت کیا تھا......وہ میری گرو ہیں۔" اُس نے بتایا۔

"اوہ!......تو وحیدہ جی کے نام پر کچھ ہو جائے پھر۔ ہم صرف آج ہی کی رات ایک ساتھ ہیں۔"

"ایک منٹ" اس نے انگلی کھڑی کی......آئینے پر جھک کر پہلے ماتھے کی بندیا ٹھیک کی اور لپ اسٹک کا شیڈ درست کیا۔ پھر ساڑھی کا پلو کمر میں اڑس کر مجھے پیا تصور کرتے ہوئے باہیں پکڑیں۔ اُس کے بعد آنکھوں میں ابتدائے محبت کی ہوش ربا کیفیت لا کر پہلے گنگناہٹ اور پھر رقص کی چک پھیری لیتے ہوئے۔ "پیا تو سے نیناں لاگے" کا آغاز کیا......ہو بہو گائیڈ کوریوگرافی۔ صرف چہرے کا فرق تھا۔ گیت کا ایک ٹکڑا "بھور کی بیلا سہانی ندیا کے تیرے۔ بھر کے گاگر جس گھڑی میں چلوں دھیرے دھیرے" ادا کرتے ہوئے پدما جب ون اینڈ ہاف سٹیپ لیتے ہوئے لہرائی اور پھر ٹیپ کے مصرعے پر آتے ہوئے ہلکا سا ناک سکوڑ کر اُس نے نرت بھاؤ کی تین چٹکیاں میری طرف پھینکیں تو میں بے اختیار اُس سے لپٹ گئی۔ میں نے اُس کی بانہیں پکڑی اور دیو آنند کی طرح آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تسلی دی۔ "believe you Padma.....you are stuck in my love" اُس کے گیت کا آزاد ترجمہ تھا۔

دائیں بائیں ٹھہرے ہوئے انسانی حقوق کے نمائندوں کے عین بیچ ہم نے بے فکر ہو کر ناٹک کیا اور خوب ہنسے۔

لندن کی آخری رات آدھی گزر چکی۔

پدما نائٹی پہنے آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کے پن کھول کر اُنہیں برش کر رہی ہے۔ تکیہ گود میں رکھے میں اُسے دیکھ رہی ہوں اور سوچتی ہوں وہ کل چلی جائے گی۔ میں بھی کل جا رہی ہوں۔ ہمارے طیارے ایک ہی جگہ سے اُڑ کر ایک ہی سمت پرواز کریں گے۔ ایک ہی سا فاصلہ

طے کریں گے اور پھر نیویگیشن کی ایک خلائی لکیر پر آ کر اپنے رخ بدل لیں گے۔'' پدما کتنی اچھی ہے'' میں اُسے بتائے بغیر سوچتی ہوں۔

کیا ہم......یعنی اپنے اپنے ملک کی طرف سے ہیومن رائیٹس کے مقرر اور مبلّغ ......اپنے اپنے وطن پہنچ کر بھی اُسی آزادی سے ایک دوسرے سے مل سکیں گے جس کے حصول اور نفاذ کے لئے پچھلے پانچ دن ہاہا کار مچی رہی......او گاڈ......اگر پدما بھی مجھ سے یہی سوال پوچھ بیٹھے تو یقیناً میرا جواب بھی وہی ہوگا جو میرے پوچھنے پر پدما دے گی۔

ہوٹل سے انکل کو فون کیا کہ آ رہی ہوں۔ٹیکسی فراٹے بھرتی ونڈمل لین پہنچی تو انکل دریچے کا پردہ ہٹائے میرے انتظار میں کھڑے تھے۔'' گڈ مورننگ اینڈ گڈ ڈے......گیارہ بج رہے ہیں اور چار بجے فلائٹ ہے'' میں نے انکل کو پہلی اطلاع یہی دی۔

'' یہ کیا کہہ رہی ہو'' انکل دریچے سے ہٹ کر میری طرف آئے۔ چہرے پر حیرت کا تاثر نمایاں تھا۔

یہ بھی اچھا ہوا ڈنر کینسل ہو گیا۔ میں آج واپس جا سکتی ہوں۔اگلی فلائٹ تین دن بعد ملے گی۔'' میں نے انکل کی گھوسٹ فیملی اور ڈنر کے خودساختہ التوا پر اُنہیں شرمندگی سے بچالیا۔

کیسا رہا تمہارا کنونشن؟ چھڑی ایک طرف ٹکا کر بیٹھے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

ونڈرفل اینڈ موسٹ ایجوکیٹنگ۔

لندن بھی کچھ دیکھا؟

'' کچھ کچھ'' ......میں نے مختصراً اپنا اور پدما کا سیاحت نامہ بیان کر دیا۔انکل مطمئن ہوئے۔

اچھا اپنے ابا کے لئے میری طرف سے ایک تحفہ لیتی جاؤ، خوش ہو جائے گا......وہ کلوزٹ کھولو۔ انہوں نے اشارہ کیا کلوزٹ کھلی تو دیکھا زمانے بھر کا سامان ٹھونس رکھا ہے۔ کچھ کپڑے ہینگروں پر اور کچھ گٹھڑیوں کی صورت جو کتابوں اور پرانی تصویروں کے ساتھ فرشی حصے پر بکھرے پڑے تھے۔ درمیانی خانے میں وہ تحفے بھی پڑے تھے جو میں انکل اور ان کے بچوں کے

لئے لائی تھی۔ انکل نے بالائی ریک پر ویڈیو کیسٹس کی قطار میں سے کونے کی آخری کیسیٹ نکالنے کا کہا۔

''اوہوہو...... Naushad in Movie Mahal...... یہ تو واقعی ابا کے لئے ہونا چاہیے'' مجھے یوں لگا جیسے کوئی خزانہ ہاتھ لگ گیا ہو۔

''جی جناب'' انکل نے فخریہ کہا'' یہ بی بی سی چینل فور کا تحفہ ہے۔ تمہارا ابا نوشاد کا دیوانہ ہے، اُسی کے لئے ریکارڈ کیا تھا۔'' میں کیسٹ کا تحفہ ہینڈ بیگ میں ڈال رہی تھی کہ اپنے لائے تحفوں کا بھی پوچھ لیا آیا بچوں کو پسند آئے تھے۔ انکل نے نہ صرف ان کا شکریہ پہنچایا بلکہ یہ انکشاف بھی کیا کہ دوسرے ہی روز بیٹے جب ان کا حال پوچھنے آئے تو تحفے ساتھ لے گئے تھے۔

انکل کا یہ بیان سن کر میں نے حواس بحال رکھے اور بھول گئی کہ بے کسی کے عالم میں وہ تحفے میں نے ابھی ابھی کلوزٹ میں دیکھے تھے۔

اور یہ لو تمہارے لئے۔

انکل نے بیگ کھول کر ایک خوبصورت منی ریکارڈر مجھے دیا۔

تھینک یو انکل۔ یہ میرے فیلڈ ورک میں کام آئے گا...... تھینک یو ونس اگین۔

ہوم ڈلیوری لنچ کے بعد ایئر پورٹ چیک اِن کے خیال سے میں نے کسی ٹیکسی کے لئے فون کرنے کا کہا تو انکل بجھ سے گئے۔ ٹیکسی آئی تو اُن کی آنکھوں میں زندگی کی ساری تنہائیاں امڈ آئیں۔ اُنہوں نے میرا ماتھا چوما اور خُدا حافظ کہا۔

انکل دریچے میں کھڑے میری واپسی کا منظر دیکھ رہے تھے۔ میں نے الوداعی ہاتھ لہرایا۔
ٹیکسی چلی تو منظر بدلا۔ اب صرف دروازہ اور بس اسٹاپ آمنے سامنے تھے۔

انتساب

دسمبر کی یخ بستہ کہر آلود صبح، ہر چیز دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ رگوں میں لہو منجمد کر دینے والی سردی کے باوجود پورا شہر زندگی کی حرارت سے بھرپور اپنے اپنے معمولات کی طرف رواں دواں ہے۔ شہر کی اس معروف سڑک پر لوگ ایک دوسرے سے بے نیاز اپنے پورے دن کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے چہرے ان کے معمول اور حالات کا آئینہ بنے ہوئے ہیں چہروں پر بکھری بے زاری اور لباس کی بے ترتیبی (جو کچھ مالی حالت اور کچھ مزاج کی عکاس ہے) ان کے گریڈ اور مالی حالت کا اعلان چیخ چیخ کر کر رہی ہے۔ ہاتھ میں پکڑا ہوا سلور کا ٹفن گویا شفاف شیشے کا بنا ہوا ہے۔ جس میں ایک مڑا تڑا پراٹھا اور رات کا بچا ہوا سالن جو سردی کی شدت سے پراٹھے کی سطح پر جم کر اپنی اصلی شکل اور ذائقے سے محروم ہو چکا ہے، بڑا واضح نظر آ رہا ہے۔ خاکروب نے جھاڑو سے گرد کے بادل تان دیئے بچوں کی ایک ٹولی گرد سے بے نیاز بنا کھانسے ہی کھلکھلاتی ہوئی گرد کے درمیان سے گزر گئی جب کہ یونیورسٹی بس کے انتظار میں سٹاپ پر کھڑے تمام لڑکے اور لڑکیوں نے اپنے رومال اور ٹشو پیپرز ناک پر رکھ لئے۔ چند منٹ کے بعد یونیورسٹی بس آ گئی۔ سٹاپ پر کھڑے لوگ سوار ہوئے اور بس ان کے بیٹھنے کا انتظار کئے بغیر روانہ ہو جاتی ہے۔ بس کے اندر کا ماحول خاصہ گرم ہے۔ ہر شعبے کے طالب علم موجود ہیں، لڑکیاں سیٹ پر بیٹھتے ہی اپنے اردگرد بیٹھی لڑکیوں کا جائزہ لیتی ہیں اور دل ہی دل میں حساب لگا رہی ہیں کہ فلاں لڑکی نے یہ سوٹ کتنے دن پہلے پہنا تھا۔ آج اس کے لباس کا رنگ اسے سوٹ کر رہا ہے یا نہیں

انہیں ایک دوسرے کے تمام لباس، رنگ اور تعداد زبانی یاد ہے۔ میں نے اپنے برابر بیٹھی لڑکی کو تنقید ی نظروں سے دیکھا تو قدرے ناگواری سے سوچا اسے تو بالکل ہی تمیز نہیں لباس پہننے کی حالانکہ اسی رنگ کا سوٹ اس نے صرف دو دن ہی پہلے تو پہنا تھا اور آج پھر اسی شیڈ میں دوبارہ پہن کر آ گئی ہے۔ کم از کم یونیورسٹی میں اتنا شعور تو آ جانا چاہیے۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے لباس اور ان کی تعداد سے ان کی مالی حالت کا اندازہ لگا رہی ہیں، کچھ سے مرعوب اور کسی کے سامنے نخوت سے بیٹھی ہیں۔ بس کے پچھلے حصے میں لڑکوں کی آوازیں آ رہی ہیں جو مختلف موضوعات پر بحث کر رہے ہیں، ساتھ ہی کسی منچلے کا قہقہہ سنائی دیا۔ میں بس کے اندرونی منظر سے نظریں ہٹا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

بس شہر کی اس شاہراہ سے گزر رہی ہے جو نہ صرف تمام علاقوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے بلکہ ہائی وے بھی کہلاتی ہے۔ یعنی دوسرے شہروں سے رابطے کی بھی یہی سڑک ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سال، پہلے جب نئی حکومت آئی تو اس کے ترقیاتی بجٹ میں اس شاہراہ کی تعمیر نو اور آرائش شامل تھی لہٰذا گذشتہ ایک سال سے یہ شاہراہ تعمیر نو اور آرائش وزیبائش میں مصروف تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کے علاقوں کو سبزہ زار کی شکل دی جا رہی تھی، مصروف چوراہے کے قریب تالاب بنا کر پارک بنایا گیا ہے۔ اچانک بس رک گئی شاید سڑک پر کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ بس میں بیٹھے تمام لوگ ایک لمحے کے لئے سکتے میں آ گئے اور ہر ایک کے ذہن میں اپنے گھر سے سکول کالج اور دفتر جانے والوں کا خیال آیا جو روزانہ اسی سڑک سے گزر کر جاتے ہیں۔ چہروں پر پریشانی جھلکنے لگی۔ تنقیدی نظروں میں سراسیمگی نظر آنے لگی۔ کنڈیکٹر اور لڑکے بس سے اتر گئے، سڑک پر ہجوم تھا ہر نیا آنے والا کچھ دیر وہاں رکتا اور پھر آگے چل دیتا۔ اتنے ہجوم میں بس کے اندر سے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ حادثے کی نوعیت کیا ہے۔ لڑکیاں بے چینی سے اس آواز کا انتظار کر رہی تھیں جو صورت حال کو واضح کرے۔ میں نے سیٹ سے گردن لمبی کر کے سامنے سکرین سے جھانک کے صورت حال جاننے کی کوشش کی مگر رکتے اور چلتے لوگوں کے علاوہ کچھ نظر نہ

آیا۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کوئی مر گیا ہے۔ میری آنکھوں میں اپنے گھر کا منظر گھوم گیا،
چھوٹا بھائی سکول جانے کے لئے سائیکل صاف کر رہا ہے اور حسب معمول میرے ساتھ جملہ بازی
بھی، اس کی عینک کے پیچھے سے جھانکتی شریر آنکھیں مجھے بہت پیاری ہیں۔ ابو بہت جلدی میں ہیں
شاید آج پھر لیٹ ہو گئے ہیں۔

ایک کپکپی آئی اور میں نے دل میں آنے والے برے خیال کو زبردستی پرے دھکیل دیا
اور سوچا نہیں ایسا ہونا ناممکن ہے مگر یہ منحوس خیال پھر آ جاتا ہے۔ میں اس سے نظریں چرا کر اپنی
ساتھی لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگتی ہوں مگر حیران ہو گئی کہ ان کے چہرے بالکل میرے چہرے جیسے
ہو گئے۔ ایک دم مجھے احساس ہوا کہ ان کے کندھوں پر گویا میرا ہی سر رکھ دیا گیا ہو اور وہ سوچ بھی
میری طرح رہی ہیں۔ میں نے پریشان ہو کر ڈرائیور کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی سیٹ پر بیٹھا
تھا مگر ہر احساس سے عاری۔ مجھے تلاش کے باوجود اس کے چہرے پر کچھ نظر نہ آیا۔ نہ تشویش نہ
تجسس۔ پھر اس نے بے زار ہو کے ہارن پر ہاتھ رکھا اور دباتا ہی چلا گیا، مسلسل بجنے والے ہارن
نے لڑکوں اور کنڈیکٹر کو واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے ہوئے بس میں سوار
ہونے لگے، ہر شخص کچھ نہ کچھ بول رہا تھا مگر لڑکیاں پھر بھی نہ سمجھ پائیں کہ کیا ہوا؟ وہ لوگ اپنی اپنی
سیٹوں پر بیٹھنے لگے، آخر میں کنڈیکٹر نے بس میں سوار ہو کر بڑی بے زاری سے کہا کہ چلو استاد
جی۔ مزدور تھا اپنی ہی ٹرالی تلے آ کر کچلا گیا۔ اطمینان کی ایک لمبی سانس میرے سینے سے خارج
ہوئی اور ایسی ہی سانسیں اپنے اردگرد محسوس کیں۔ ایک لمحے کے لئے سکوت طاری ہو گیا، سکون ہو
گیا۔ پوری بس میں شاید تمام لوگ اس ذہنی کوفت سے چھٹکارا حاصل کر رہے تھے جو چند منٹ پہلے
انھوں نے برداشت کی تھی۔ کنڈیکٹر نے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا استاد جی جلدی کرو، پورے
پانچ منٹ لیٹ ہو گئے ہیں آج۔ میں سمجھ نہ سکی یہ گالی کس کے لئے تھی ہجوم کے لئے جس نے روڈ
بلاک کر کے بس کو رکنے پر مجبور کیا یا اس مرنے والے کے لئے جس کی وجہ سے ہجوم تھا۔

سلسلہ پھر وہیں سے جڑ گیا جہاں سے منقطع ہوا تھا یعنی تنقیدی جائزے اور خوش گپیاں

پھر سے شروع ہوگئیں، میرے پیچھے کی سیٹوں پر شاید کوئی پروفیسر صاحب بیٹھے تھے وہ گذشتہ شام کسی سیمینار میں مہمان خصوصی تھے جو انسانیت کے موضوع پر تھا، ان کے سٹوڈنٹ اُن کی تقریر اور مقالے کو بڑے پر جوش انداز میں سراہ رہے تھے، ان کا خیال تھا کہ پروفیسر صاحب کی تقریر بے حسی اور مردہ ضمیروں پر ضرب کاری تھی۔ لفظ انسانیت بے حسی اور ضمیر سن کر مجھے ہنسی کا دورہ پڑ گیا، کوشش کے باوجود میں اس پر قابو نہ پا سکی۔ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے۔ اگلے ہی لمحے نفرت کا شدید احساس پیدا ہوا اپنے لئے' اس لمحے کے لئے جس لمحے وہ اطمینان بھری سانس میرے سینے سے نکلی۔ ہنسنے سے میری آنکھوں میں پانی بھر آیا اور شاید میرا کاجل آنکھوں کے کناروں سے باہر آ گیا تھا میں نے گود میں رکھی فائل کے شیشے پر چہرہ جھکایا مگر یہ کیا؟ یہ چہرہ میرا تو نہیں تھا میں نے پریشان ہوکر دوسروں پر نگاہ ڈالی، تمام چہرے پھر سے میرے جیسے ہو گئے، غلیظ آنکھوں اور مکروہ تھوتھنی والے۔ 25 منٹ کا راستہ بڑا طویل ہوگیا۔ ڈیپارٹمنٹ کے سٹاپ پر بس رکی تو تمام لوگ انہیں چہروں سمیت اتر گئے اور میں بھی۔ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے سب سے نظریں چُرا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو تھوتھنی بدستور موجود تھی، کیا کیا جائے؟ پھر دل نے سوچا اور لوگ بھی تو ہیں جو ان چہروں سمیت یہاں پھر رہے ہیں۔ سو میں بھی اسی چہرے کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی۔ تمام دن وہ شخص میرے حواس پر سوار رہا جس کی سال بھر کی سرد صبحیں اور جلتی دوپہریں شاہراہ کی آرائش کے لئے پتھر اٹھاتے روڑی کوٹتے گزریں اور آج جب وہ اپنی ہی ٹرالی پر لدی اینٹیں اتارتے ہوئے ان کے تلے دب کر ہلاک ہو گیا تو اس شاہراہ سے گزرنے والوں نے اسے ایک کتے سے زیادہ اہمیت نہ دی جو کسی ٹرک تلے آ کر کچلا گیا ہو۔ واپسی پر گزرتے ہوئے میں نے اس جگہ کو دیکھا کچھ بھی نہیں تھا سوائے اینٹوں کے ڈھیر کے لوگ اسی طرح گزر رہے تھے۔ میں نے سڑک کے دونوں طرف نگاہ ڈالی سڑک واقعی خوبصورت ہوگئی تھی، تعمیر و آرائش کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا بس کہیں کہیں چھوٹی موٹی کمی ہے جو آج کل میں پوری ہو جائے گی۔ ہاں ایک اور چیز بھی رہ گئی تھی اس سڑک کو کسی ''بڑے'' نام سے

منسوب کرنا اور کسی بڑے سیاستدان یا سماجی کارکن کے ہاتھوں اس کا افتتاح جس نے اس کی تعمیر کے لئے بڑی محنت کی یعنی حکومت سے گرانٹ منظور کرائی جو بڑی سر دردی کا کام ہے۔ ایسے ہی ایک خیال ذہن میں آیا کہ کیا آج صبح اس کا افتتاح نہیں ہو گیا؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس شاہراہ کو اس کے نام سے منسوب کر دیں شاید اسی طرح ہی ہماری شکلیں پھر سے اپنی اصلی حالت میں آ جائیں۔ مگر یہ ناممکن ہے کیونکہ یہ ایک بڑی شاہراہ ہے اور اسے منسوب بھی کسی بڑے نام سے ہونا ہے۔ کئی دسمبر گزر گئے مگر یہ سڑک ابھی تک انتساب سے محروم ہے۔ وہ انتظار کر رہی ہے کسی پجارو کے الٹنے کا کسی بم کے دھماکے کا، کسی سیاستدان کے شہید ہونے کا۔

جس دن رچرڈ نے مجھے خریدا

کرسمس کی شام گلیڈس سے میرا تعارف ہوا۔ ہم تینوں بہنیں اوپر اٹیک میں یونیورسٹی کیمپس کی طرح فرش پر آڑی ترچھی بیٹھی خواتین کے دل پسند موضوعات پر باتیں کرتے وقفے وقفے سے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھیں۔ ہمیں ہنسی کے ایسے دورے عام طور پر اس وقت پڑتے تھے جب ہم کسی کی تحسین کی بجائے نقل اتار کر اس کی غیبت میں مشغول ہوتیں۔ اس وقت بھی یہی کچھ ہو رہا تھا کہ ماموں اوپر آئے۔

''میں تمہیں رچرڈ کے ہاں لے جا رہا ہوں، ہنسنا بند کرو اینڈ گیٹ ریڈی''

ہم ایک دم خاموش اور مؤدب ہو گئیں۔ انہوں نے کھڑے کھڑے کمرے کے ڈسپلن کا جائزہ لیا۔ پہلے باتھ روم کا دروازہ بند کیا پھر ڈھلانی چھت سے جھانکتے سکائی لائٹ کا پٹ گرا کر سیڑھیاں اترنے سے پہلے دوبارہ تاکید کی۔

''فٹافٹ تیار ہو جاؤ۔ آئی وانٹ ٹو سی یو ڈاؤن ود ان ٹین منٹس''

آدھی سے زیادہ عمر لندن میں گزارنے کے باوجود ماموں کی اردو زبان سے محبت ان کے ہر جملے سے ٹپکتی تھی۔ ایک دوسری کی مدد کرتے ہم وار ایمرجنسی کی پھرتی کے ساتھ بقول ماموں فٹافٹ تیار ہو کر نیچے اتر آئیں۔

''ویری گڈ، بہت اچھے'' ماموں نے باترجمہ انگریزی سے ہماری تعریف کی۔ کچن کے ساتھ لگی ڈائننگ ٹیبل پر رچرڈ کے لئے شیمپین اور گلیڈس کے لئے پرفیوم کے کرسمس گفٹ پڑے

تھے۔ وہ اٹھائے اور ہمیں لے کر باہر نکلے۔

رچرڈ کا مکان ملحقہ تھا۔ بدن کو کاٹتی سردی میں ٹھٹھرتے، منہ سے بھاپ اڑاتے اور جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے ہم نے ابھی واک وے پر چند قدم ہی لیے تھے کہ ریمبو نے ہماری آہٹ سونگھ کر خوف ناک طریقے سے بھونکنا شروع کر دیا۔ وہ گھر کے پچھواڑے سن روم میں لیٹا ہمارے آنے پر ایک دم سکیورٹی پر اتر آیا۔ اس کے مسلسل بھونکنے اور غرانے پر رچرڈ نمودار ہوا۔ بیس بال کے سیاہ فام طویل قامت کھلاڑی جیسے رچرڈ نے ہمیں دیکھ کر خوش دلی سے ہاتھ لہرایا تو نیم روشن سن روم میں اس کے سفید دانت چمکے۔ پھر اس نے ریمبو کو خاموش رہنے کے لئے ڈانٹا اور لائٹ جلائی۔ شیشے کی دیواروں کے پار جب ہم اور نمایاں ہوئے تو ریمبو پھر بھونکا۔ رچرڈ نے اسے گڈ بوائے کہہ کر پچکارتے ہوئے دروازہ کھولا۔ کتا اب بھی چپ نہ ہوا۔ ہم سن روم عبور کر کے اندر آئے تو ریمبو بدستور غصے میں غراتا رہا۔ ہم نے سنا رچرڈ اسے کہہ رہا تھا ''تم گڈ بوائے نہیں بلکہ گندے بچے ہو۔ میں تمہیں کل سے واک کے لئے بھی نہیں لے جاؤں گا'' کتا چوں چوں کرتا چپ ہو گیا جیسے اس نے واک پر نہ لے جانے کی دھمکی سمجھ لی۔ ریمبو سے نپٹ کر رچرڈ اندر آیا۔

گلیڈس ایک آرام دہ کاؤچ پر بیٹھی مشروب کی چسکیاں لے رہی تھی۔ اس کی چھڑی دیوار سے لگی تھی۔ ہم نے دونوں کو کرسمس کی مبارک باد دی۔ ماموں اور رچرڈ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کونے میں لگی میز کے پاس بیٹھ گئے۔ رچرڈ کے مشروب کا آدھا گلاس میز پر رکھا تھا جس کے ساتھ مختلف اقسام کی وائن اور وسکی کی بوتلیں کنگ سائز کوک پیپسی، کرسمس کیک اور چپس دھرے تھے۔ ساتھ رنگیں روشنیوں سے چمچماتا کرسمس ٹری ایستادہ تھا۔ وال کیبنٹ پر خوبصورت فریم میں لگے گروپ فوٹوگراف جو سبھی رچرڈ فیملی کے تھے۔ گلیڈس کے ساتھ رچرڈ کی اکلوتی تصویر سنہری فریم میں لگی ٹی۔ وی کے اوپر رکھی تھی۔ دونوں سادہ لباس، کسی میلے کے ہجوم میں کھڑے مسکرا رہے تھے۔

کمرے کی سجاوٹ سے مخصوص کرسچن ماحول نمایاں تھا۔ دیواروں پر بڑے بڑے

سنہری فولڈنگ پھول اور غبارے سکاچ ٹیپ سے چسپاں تھے جن کے درمیان نقرئی پٹی کے حلقوں سے بنائی زنجیریں نصف دائروں میں چاروں طرف لٹک رہی تھیں۔ چھت پر چمکیلے کاغذی رنگین فانوس آویزاں تھے۔ ریڈیو گرام پر مقدس نغموں کا لانگ پلے بج رہا تھا جس کے اوپر حضرت عیسیٰ کے آخری طعام کی پینٹنگ رکھی تھی۔ ہم اس کی مقابل دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ہمارے سروں کے اوپر پاک مریم کی گود میں ننھے عیسیٰ کی تصویر تھی اور سامنے کافی ٹیبل، جس کے ایک طرف گلیڈس کاؤچ پر بیٹھی مشروب پینے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی پی نٹ کی گری اٹھا کر منہ میں ڈال لیتی۔ ماموں نے پہلے گلیڈس کا تحفہ جھک کر اسے پیش کیا اور پھر رچرڈ کو اس کا کرسمس گفٹ دیا، یعنی سنہری کاغذ میں لپٹی شیمپین کی ایک بوتل جس کے گلے میں سرخ ربن بندھا ہوا تھا۔

ماموں اور رچرڈ نے اپنی کرسمس تقریبات کا آغاز کر دیا تو فرح نے پہلے ماموں اور پھر میری طرف دیکھ کر ناک سکوڑا۔ مذہبی خیالات کے سبب اسے میز کے گرد بیٹھے لوگوں کا مشغلہ اچھا نہیں لگا۔ میں قدرے لبرل ہوں، اس لئے ماموں کے ہیومن رائٹ کے خلاف کوئی منفی خیال دل میں نہ آیا۔ رہی ہم دونوں سے چھوٹی بشریٰ، اسے دم مارنے کی گنجائش ہی کہاں تھی کہ وہ ماموں کے گھر کی بہوتھی اور لندن کے سماجی آداب سے واقف۔ دبی دبی ہنسی کے بعد ہم تینوں نے چہروں پر سنجیدگی طاری کی اور گلیڈس کے پیش کردہ پیپسی کے ساتھ پی نٹ ٹھونگتی اور چپس چباتی رہیں۔ بشریٰ نے ہم دونوں کا زبردست تعارف کرایا اور کالج اور یونیورسٹی کے زمانے کے بہت سے لطیفے سنائے جسے گلیڈس حیرت اور مسرت کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ سنتی رہی۔ ماموں کے ہاں آمدورفت کے سبب وہ بشریٰ سے کافی بے تکلف تھی جس کا ثبوت گلیڈس کا کبھی کبھی اس پر مصنوعی غصے سے غرانا یا چھڑی کو بندوق کی طرح نشانہ لے کر بلند آواز میں ''ڈشوں'' کا فائر کرنا تھا۔ فائر کرنے کے بعد وہ بے تحاشہ ہنسنے لگتی جس سے اس کا پیٹ ہلکورے لینے لگتا، گال سرخ ٹماٹر ہو جاتے اور عینک ناک کے سرے پر کھسک آتی جسے وہ انگلی کی ٹھوکر سے پھر سے اوپر جما دیتی۔

ہم باتوں میں لگے تھے کہ ماموں اور رچرڈ افلاک کی بلندیوں پر اڑتے اڑتے امریکہ

کی عراق پر بمباری کے موضوع پر ایک دوسرے سے الجھنے لگے۔ بمباری کی حمایت میں برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے تازہ بیان کے حوالے سے رچرڈ نے ٹونی بلیئر کو جب بلند آواز میں ملاحوں کی زبان میں ایک گالی دی تو گلیڈس چونکی

''ہے رچی! اپنے آپ کو سنبھالو، ہمارے پاس لڑکیاں مہمان ہیں اور آج کرسمس ہے۔نو پالیٹکس......اینڈ نو فاؤل لینگوئج......او......کے؟''

''مجھے بات مکمل کر لینے دو'' رچرڈ نے توجہ دیئے بغیر کہا۔

''تو کمرے میں چلے جاؤ اور بات مکمل کرو'' گلیڈس نے چھڑی اٹھا کر کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

مے خواروں نے اپنے اپنے گلاس اٹھائے اور کمرے کی طرف جاتی راہداری میں گم ہو گئے۔

اب گلیڈس چھڑی کے سہارے اٹھی اور میز پر رکھے کرسمس کیک کے چند ٹکڑے کاٹ کر ہمارے سامنے رکھ دیے، ہمارے لیے مزید کوک ڈالا اور پھر اپنا گلاس بھر کر مونگ پھلی کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''لندن کی زندگی سے میں مجھے اکتانے لگی ہوں، خاص طور پر اس گنٹھیا کے بعد'' اس نے اپنی دونوں ٹانگیں آگے پسار کر سوجے ہوئے ٹخنے دکھائے۔ ''ڈاکٹر کہتا ہے تمہاری ٹانگوں کی ہڈیاں کمزور پڑ چکی ہیں، وہ تمہارے بھاری دھڑ کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتیں، تم عنقریب وہیل چیئر پر چلی جاؤ گی''۔

اس افسوس ناک اطلاع پر ہم نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

لیکن میں شروع ہی سے اتنی بھاری بھرکم نہیں تھی۔ بُشی! ذرا بہنوں کو میری وہ تصویر تو دکھاؤ۔ اس نے ٹی وی پر رکھی اپنی اور رچرڈ کی تصویر کی طرف چھڑی سے اشارہ کیا۔ وہ بشریٰ کو بشی کہہ کر پکارتی تھی جیسے رچرڈ کو رچی۔

تصویر لائی گئی۔ برازیل کے مشہور فٹ بالر پیلے سے مشابہہ دراز قد رچرڈ کنٹری فراک میں ملبوس نوجوان گلیڈس کا ہاتھ تھامے کھڑا تھا۔ دونوں مسکرا رہے تھے۔ پس منظر میں دیہاتی میلے کی سی دکانیں اور لوگ نظر آ رہے تھے۔ گلیڈس کے پیچھے ایک اوڈ روین تھی جس کے دروازے میں ایک کم عمر لڑکا کھڑا تھا۔

''یہ رونی ہے، میرا چھوٹا بھائی'' اس نے لڑکے پر اُنگلی رکھ کر بتایا۔ ''اب اسے الٹ کر دیکھو''

ہم نے تصویر پلٹی۔ برٹش رائیٹنگ میں ایک جملہ لکھا تھا۔

The day Richard bought me

11 June 1988

Hayes Sunday Market, Middlesex.

ہم نے تصویر کافی ٹیبل پر رکھ دی اور تحریر کے پراسرار معنی پر قدرے حیران ہوئیں۔ گلیڈس کے ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ تھی۔ ہمارے چہروں کی حیرت بھانپ کر بولی۔

''ہاں یہ سچ ہے'' بالکل سچ ہے۔ رچرڈ نے مجھے واقعی خریدا تھا۔ ہیز سنڈے مارکیٹ میں یہ سب کچھ اچانک ہو گیا۔ کیا تمہیں یقین نہیں آ رہا؟''

صوفے پر ایک قطار میں بیٹھی ہم تینوں بہنوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''گلیڈس تم ایک دم عجیب ہو'' میں نے دل میں کہا۔

ماموں اور رچرڈ جھومتے ہوئے راہداری میں نمودار ہوئے۔

''لڑکیو! کیا وقت ہوا ہے؟'' ماموں نے اپنی گھڑی دیکھنے کی بجائے ہم سے پوچھا۔

''پاسٹ مڈنائٹ'' بشریٰ نے کلاک پر نظر ڈال کر کہا۔

''سو اِز مائی آئیڈیا...... میرا بھی یہی خیال ہے'' ماموں نے باترجمہ اتفاق کیا۔

''کرسمس اِز اوور...... لیٹس بی اَپ اینڈ گوئنگ...... چلو لڑکیو''

ہم نے رچرڈ اور گلیڈس کی میزبانی کا شکریہ ادا کیا اور گڈ نائٹ کہا۔
واپسی پر مجھے یہ ٹوہ لگ گئی کہ رچرڈ کا گلیڈس کو سنڈے مارکیٹ میں خریدنے کا قصہ کیا ہے؟

آئندہ ایک ہفتہ بلکہ صحیح اعداد و شمار کے مطابق اگلے نو دن شدید برف باری ہوئی۔ یہی برف کرسمس کی رات پڑتی تو بڑے اسے وائٹ کرسمس کا نام دیتے اور بچے آتش دان کے سامنے بیٹھے اپنے تحفوں کے حصول کے لئے کرسمس فادر کا انتظار کرتے جس کی کھلونوں سے بھری گاڑی کو کھینچنے والے بارہ سنگھے بادلوں پر اڑتے اڑتے برف باری میں پھنس جاتے۔ کھلونے ملنے کی تاخیر پر سبھی بچے کرسمس فادر کی اس مجبوری پر منہ لٹکائے سونے کے لئے چل دیتے۔ تاخیر کی یہ کہانی ہر گھر میں ان بچوں کو سنائی جاتی۔

برف باری کے یہ دن میں نے بشریٰ کے ایٹک میں گزارے جہاں ہم تینوں بہنوں کے پاس سوائے غیبت کرنے کے اور کوئی کام نہ تھا اور تو اور ہم نے لیڈی ڈیانا تک کو نہیں بخشا۔ مونیکا لیونسکی بھی زیر کلام آئی لیکن فرحت کے مذہبی خیالات اور اخلاقی اصولوں کی پاسداری کے علاوہ مونیکا کی حددرجہ بے باکی کے سبب ہم نے اسے ڈراپ کرتے ہوئے غیبت کا رخ بروک شیلڈ اور آندرے آگاسی کی ممکنہ طلاق کی طرف پھیر دیا۔

برف باری جاری تھی کہ ہم گلیڈس کو ہیپی نیو ایئر کہنے پہنچیں۔ دیکھا تو زمانہ ہی بدلا ہوا تھا۔ سن روم میں لیٹا ہوا ریمبونہ ہمیں دیکھ کر بھونکا نہ غرایا بلکہ ایک طرح کے فیملی فرینڈ سمجھتے ہوئے صرف ایک نظر دیکھ کر آنکھیں موند لیں۔ گلیڈس نے دروازہ کھولا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں تھی اور اس کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے لگاتار روتی رہی ہو۔ کمرے میں کرسمس کی آرائش بدستور موجود تھی۔ چھڑی کے سہارے گلیڈس پہلے کی طرح کافی ٹیبل کے پاس کاؤچ پر بیٹھ گئی اور ہم دیوار کے ساتھ لگے صوفے پر۔ وہ خاموش تھی۔ بشریٰ نے اپنی بے تکلفی کے سہارے چہرے پر مصنوعی بشاشت لاکر چاکلیٹ کا ڈبہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا ''ہیپی نیو ایئر گلیڈس''

''نو پپی نیوایئر'' اس نے سامنے کی طرف نظریں جمائے افسردگی سے جواب دیا۔

''گلیڈس تم ٹھیک تو ہو؟'' میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔'' رچرڈ کہاں ہے؟''

''وہ نہیں ہے۔اس ملک میں بھی نہیں۔اسے جینی نے خرید لیا''

گلیڈس کے اس جواب پر ہم حیرت میں ڈوب گئیں۔

''کیا مطلب جینی نے خرید لیا، رچرڈ کوئی ریفریجریٹر یا واشنگ مشین تو نہیں کہ اسے خرید لیا جائے؟''

اب گلیڈس میری طرف متوجہ ہوئی...... بالکل اسی طرح جس طرح رچرڈ نے مجھے خریدا۔تم نے وہ تصویر دیکھی ہے؟ اس نے ٹی وی پر رکھی اس تصویر کی طرف چھڑی کا رخ کیا جو ہم کرسمس کی شام دیکھ چکے تھے۔

سال کا پہلا دن میرے لیے یہی خبر لے کر طلوع ہوا ہے......وہ دیکھو اس نے ٹیبل پر رکھے لفافے میں سے ایک تصویر اور خط نکال کر ہمیں دیا۔

ہم تینوں اس تصویر پر جھک گئیں۔خوشی سے دانت نکال کر ہنستا ہوا رچرڈ ایک بلیک بیوٹی کے ساتھ ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا۔اب میں نے خط سامنے کیا۔فرحت اور بشریٰ بھی آگے سرک آئیں۔

Dear Gladys, I am sold. Gennie bought me last Sunday at Hays Market. We are leaving England. You can continue Car Boot Sale as before. Good bye.

Richard

خط اور تصویر دیکھنے کے بعد ہم نے رحم بھری نظروں سے گلیڈس کو دیکھا۔شاید ہم تینوں ایک ہی بات سوچ رہی تھیں کہ گنٹھیا کی مریض عنقریب وہیل چیئر پر جانے والی گلیڈس اب کیا کرے گی؟ میں نے تاسف کا ایک گہرا سانس لیا۔صرف ایک ہفتہ پہلے رنگوں اور روشنیوں میں نہایا یہ کمرہ اب کس قدر گہرے سناٹے کی گرفت میں تھا۔گلیڈس کے ساتھ ہم بھی چپ تھیں۔

''ڈیئر گلیڈس'' میں نے پھر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہمیں یہ جان کر بہت دکھ ہوا۔ کیا ہم کسی طرح تمہاری کوئی مدد کر سکتیں ہیں۔ پھر میں نے بشریٰ کو مخاطب کیا بشریٰ تم تو ادھر رہتی ہو۔ تم گلیڈس کی دوست ہو۔ اس کا خیال رکھنا اور مدد کرنا۔ ہم تو کسی دن چلی جائیں گی۔
گلیڈس نے تشکر بھری آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری جو اس کے اعصاب کی مضبوطی اور تقدیر پر بھروسہ کی علامت تھی۔

''تھینک یو گرلز۔ بشی نے ہمیشہ میرا خیال رکھا ہے۔ یہ بہت اچھی لڑکی ہے'' پھر اچانک اس نے اپنی چھڑی اٹھا کر بشریٰ کی طرف نشانہ لے کر ڈشوں کا فائر کیا۔ ہم سب ہنس پڑے۔ ماحول ایک دم افسردگی سے نکل آیا۔ گلیڈس نے چاکلیٹ کا ڈبہ کھول کر ہمیں چاکلیٹ دیئے اور خود دو منہ میں ڈال کر ہنستے ہوئے کہا'' آئی ٹیک ٹو''

گلیڈس واقعی بلند حوصلہ اور خوش مزاج تھی۔

ماحول درست ہوا تو میری کہانی کار جستجو بیدار ہو گئی۔ اب تک یہی معلوم تھا کہ بیس سال پہلے رچرڈ نے گلیڈس کو خریدا اور اب جینی رچرڈ کو خرید کر لے گئی۔ یہ خریدنے اور بکنے کے حیرت انگیز سودے کس طرح ہوئے اور کہاں ہوئے یہ معلوم کرنے کے لئے میں نے گلیڈس کو ٹٹولا۔ وہ چاکلیٹ کا ایک اور جوڑا منہ میں رکھ رہی تھی کہ میں نے پوچھا۔

گلیڈس ڈیئر۔ ہم رچرڈ کو اس طرح تمہیں چھوڑ کر چلے جانے پر بے حد اداس ہیں۔ براہ کرم بتانا پسند کرو گی کہ یہ سب کب اور کس طرح ہوا۔ میں کہانیاں لکھتی ہوں تمہاری کہانی بھی لکھوں گی۔ پلیز مجھے سب کچھ بتاؤ۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور چھڑی سے اشارہ کر کے کہا'' شرارتی''

اب بشریٰ نے بھی اصرار کیا اور کہا'' گلیڈس مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہاری زندگی میں اتنی فینٹسی ہے''...... فینٹسی کا لفظ اس نے گلیڈس کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے کہا۔ کچھ دیر چپ رہنے اور عینک کے پیچھے سے ہمیں گھورتے رہنے کے بعد بالآخر وہ مان گئی۔ ٹانگیں سیدھی

کیں اور پیٹ پر ہاتھ باندھ کر کاؤچ سے ٹیک لگا کر بولی۔ ''سنو...... یہ بتانا بالکل بیکار ہوگا کہ میرے باپ نے ماں کو چھوڑا تو تھوڑے ہی دنوں بعد ایک سوتیلا باپ ہمارے گھر میں تھا۔ یہ کہانی یہاں ہر گھر کی کہانی ہے۔ ماں کو دوسرے خاوند نے بھی چھوڑ دیا تو اس نے تیسری شادی کے بعد مجھے اور رونی کو پادری ڈیوڈ کے پاس اس لیے چھوڑ دیا کہ میں اپنی محتاط طبیعت کے مطابق نن بننے کی تربیت لوں اور بھائی پاسٹرل سکول میں مشنری مبلغ کے ابتدائی اسباق کی شروعات کرے۔ یہ میری ماں کی خام خیالی تھی۔ نہ مجھے نن کے طور پر خشک اور بے رنگ زندگی گزارنے کا شوق تھا اور نہ ہی رونی کو مشنری بننے کا۔ ایسے میں جو ہونا چاہیے تھا وہی ہوا، یعنی ہم دونوں ڈیوڈ کو بتائے بغیر ریڈ بل چلے آئے جہاں میرا بڑا بھائی جوزف اپنی کھٹارا لوڈر میں گھوم پھر کر نئی پرانی گھریلو چیزیں بیچتا تھا۔ وہ کبھی قصبے کو جانے والی سڑک پر لوڈر سے چیزیں نکال کر گھاس کی پٹی پر بچھا دیتا اور کبھی نزدیکی گاؤں کے چوک میں لکڑی کی فولڈنگ میزوں پر دکان لگاتا۔ میں اور رونی بھی ساتھ ہوتے۔ دکانداری خاموشی سے ہوتی تھی۔ لوگ ایک ایک چیز اٹھا کر دیکھتے اور خرید لیتے یا ویسے ہی چیزوں کا تفریحاً نظارہ کرتے گزر جاتے۔ جب کبھی جوزف ہمیں اکیلا چھوڑ کر کافی پینے چلا جاتا یا گاہک بغیر توجہ کئے گزر جاتے تو رونی اونچی آواز میں چیزیں بیچنے کی صدائیں لگاتا۔ یہ سلسلہ کئی سال چلا۔ میں ہائی سکول ڈراپ آؤٹ تھی اور اب بائیس سال کی ہو چکی تھی۔ میری کسی لڑکے سے دوستی نہیں تھی۔ ریڈ بل کے لوگوں کے لئے یہ حیران کن بات تھی۔ اتوار کی عبادت کے بعد جب میں رونی کو لئے ناک کی سیدھ گھر لوٹ رہی ہوتی تو کئی نوجوان میری توجہ حاصل کرنے کے لئے آگے پیچھے گزرتے مگر میں نہ ان کی طرف دیکھتی اور نہ ہی کسی کے سیٹی بجانے پر مسکراتی۔ اسے تم میرا انکی پن کہو گی۔ نہیں یہ بات نہیں تھی۔ میں صرف خوابوں میں زندہ رہنے والی ایک محتاط لڑکی تھی۔ میری اس طبیعت کو دیکھ کر میری ماں نے اندازہ کیا کہ مجھے راہبہ بن جانا چاہیے۔ تبھی اس نے تیسرے خاوند کے ساتھ قصبہ چھوڑنے سے پہلے ہمیں پادری ڈیوڈ کے سپرد کیا۔

گلیڈس نے کاؤچ پر پہلو بدلا اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئی۔ ہم گوش بر آواز تھیں۔ ابھی تک

بیان کی گئی داستان میں رچرڈ کی انٹری نہ پا کر میں اسے اس طرف لانے کے لئے کوئی اشارہ سوچ رہی تھی۔ اچانک بات کاٹ کر کہا۔

''گڈ لک رچرڈ......تم نے سب کو مات دے دی...... سیٹی بجانے والے لڑکوں کو بھی......اور منجمد گلیڈس کو بھی'' اشارہ کارگر ہوا تو گلیڈس بولی'' شاید رچرڈ بھی ایسا بریک تھرو نہ کر پاتا اگر میری اس کی ملاقات سے وہ اچانک نمودار ہونے والا رومانٹک دیوانہ پن نکال دیا جائے''

''کیسا دیوانہ پن؟'' میں نے پوچھا

ہوا یہ کہ ایک عرصہ جوزف کے ساتھ سنڈے مارکیٹ لگاتے میں اور رونی نے الگ سے یہی دھندا شروع کر دیا۔ جوزف کو بھی اعتراض نہ تھا۔ بلکہ وہ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا دیکھ کر خوش بھی ہوا۔ اس نے ہمیں آسان ادائیگی پر ایک پرانی لوڈر خرید دی جس پر سامان لاد کر مختلف دنوں میں مختلف جگہوں پر لگی کار بوٹ سیل اور سنڈے مارکیٹ میں جانے لگے۔

''اور ایسی ہی ایک سنڈے مارکیٹ میں رچرڈ تشریف لے آئے'' بشریٰ نے ٹی وی پر رکھی تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

تم نے بالکل صحیح کہا'' گلیڈس نے اتفاق کیا۔ اس دن میرا اور رونی کا سٹال ہیز سنڈے مارکیٹ میں تھا۔ جوزف کا سٹال ہمارے سامنے تھا۔ روزمرہ استعمال کی بے شمار گھریلو چیزوں کے درمیان گھری میں گاہکوں سے بھاؤ تاؤ میں لگی تھی کہ رچرڈ آ گیا۔ اس نے کاندھے پر تھیلا لٹکایا ہوا تھا۔ رنگ ڈھنگ سے وہ بیس بال یا فٹ بال کا کھلاڑی لگتا تھا۔ تم نے وہ تصویر تو دیکھی ہے۔ بس اس دن ہم اسی طرح تھے جیسے نظر آ رہے ہیں۔ سب کچھ اتنا اچانک اور تیزی سے ہوا کہ رچرڈ کے آنے اور اس تصویر کے کھینچنے میں بمشکل پندرہ منٹ لگے ہوں گے...... وہ آیا...... اس نے دیکھا......اور فتح کر لیا۔ گلیڈس نے معروف محاورہ دہرایا......کہانی کا یہ سنسنی خیز کلائمکس تھا اور ہم بہنوں کی حیرت بھی عروج پر تھی۔

''پلیز گلیڈس کچھ اور وضاحت کرو''

بشریٰ بولی ''ہاں وہ آیا اس نے دیکھا اور فتح کر لیا...... مگر کیسے؟'' میں نے بھی تفصیل مانگی۔

میں گاہکوں سے فارغ ہوئی تو رچرڈ نے کہا میں اس اسٹال پر موجود ہر ایک چیز خرید رہا ہوں۔ بولو کیا دام ہوں گے؟ اس کے ساتھ ہی اس نے ہپ پاکٹ سے پرس نکال کر ہاتھ پر تھپتھپانا شروع کر دیا۔ اب وہ فٹ بالر کی بجائے ٹیکساس کا کوئی بانکا مہم جو لگ رہا تھا۔ وہ چست جین اور چیک شرٹ میں جیسا کہ تم تصویر میں دیکھ سکتی ہو خاصا جچ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں بٹوہ لیے اور دوسرے کی انگلی سے سٹال کے اردگرد ہوائی دائرہ لگاتے ہوئے اس نے پھر وہی سوال دہرایا۔ ہاں بولو یہاں موجود سب چیزوں کی قیمت کیا لو گی...... سب چیزوں کی قیمت ...... تمہارے سمیت'' یہ کہتے ہوئے اسٹال کے گرد دائرہ لگاتی اس کی انگلی میرے چہرے پر آ کر ٹھہر گئی۔ بس اچانک نمودار ہونے والا یہی وہ رومانٹک دیوانہ پن تھا جس کی لپیٹ میں آ کر میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

I take you as price for the whole lot .... including me. Do you accept the bid?

یہ سنتے ہی اس نے بٹوہ ہوا میں اچھالا اور چیختا ہوا میری طرف بڑھا

Hey! whatever your name, I offer myself in price for you.

پھر مجھے گود میں بھر کر ایک گھمائی لی اور ٹیک اپ کے سامنے اتار کر کہا۔

Stay on, you are mine.

رچرڈ کے اس غیر معمولی فیصلے کے شور اور اچھل کود پر رونی حیرت زدہ رہ گیا۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ میرا بھائی جوزف بھی آ گیا اور پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ میرے جواب دینے سے پہلے ہی رچرڈ نے کندھے پر لٹکتا تھیلا کھول کر کیمرہ نکالا اور جوزف سے کہا ''میرے دوست پہلے ہماری ایک تصویر اتار دو، بعد میں تمہیں خود ہی پتہ چل جائے گا کہ کیا ہوا'' تب ہم دونوں لوڈر وین کے پس منظر میں کھڑے ہو گئے اور جوزف نے ہماری وہ تصویر اتاری۔

رچرڈ نے کیمرہ لے کر جوزف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ وہ مجھے خرید چکا ہے۔ اب میں اس کی بیوی ہوں اور ہم فوری طور پر مارکیٹ چھوڑ رہے ہیں۔

قریب آدھے گھنٹے کے دوران شروع ہو کر ختم ہونے والے اس واقعہ کی مزید وضاحت سن کر جوزف کی خوشی قابل فہم تھی۔ میرے مزاج کی سردمہری اور احتیاط کے ہاتھوں وہ میری شادی سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا اور اب اس عطائے آسمانی کے واقعہ پر اس کی خوشیاں چھلک رہی تھیں۔ ہم نے مل جل کر سامان واپس لوڈروین میں ڈالا۔ میں نے رونی اور جوزف کو الوداع کہا اور رچرڈ کو ساتھ بٹھا کر پوچھا ''کہاں چلیں؟'' وہ بولا ''میرے گھر......یعنی اس گھر میں'' گلیڈس نے کاوچ میں انگلی کھبو کر اس گھر کی نشاندہی کی جہاں اس کے روبرو بیٹھی ہم یہ داستان سن رہی تھیں۔

اور یہ جینی کہاں سے ٹپک پڑی۔ میں نے کہانی مکمل کرنے کے لئے اس ویمپ کا پوچھا۔

جینی کا سن لو۔ گلیڈس بتانے لگی۔ رچرڈ کے یہاں آنے کے بعد اس نے پورٹر کا جاب چھوڑ دیا اور میرے ہی ساتھ سنڈے مارکیٹ اور کار بوٹ سیل کرنے لگا۔ تم دیکھ سکتی ہو کہ ادھر گیراج میں یہی سامان بھرا ہوا ہے جو سیل کیا جاتا ہے۔ ہم دونوں سیل لگاتے تھے۔ جینی بھی ایسی ہی سیل کرتی تھی اور اپنا اسٹال عام طور پر ہمارے قریب یا بالکل سامنے لگاتی۔ مارکیٹ لگانے اور سہ پہر کے وقت سامان سمیٹنے میں رچرڈ اس کی مدد کیا کرتا تھا اور مجھے یوں کسی گڑبڑ کا اندیشہ نہ تھا کہ میں رچرڈ کی ایسی محبوبہ تھی جسے ایک نظر دیکھنے پر ہی وہ ڈھیر ہو گیا تھا۔ یہ تاریخ میں ہے کہ پرانے روم میں خوبصورت لڑکیوں کو شہر کے چوک میں لا کر نیلام کیا جاتا تھا۔ جس دن رچرڈ نے مجھے خریدا تو تاریخ کا ویسا ہی ایک لمحہ دوبارہ پلٹ آیا اور میں نے خود کو بیچ کر پرانی تاریخ کو پھر زندہ کر دیا۔ دوسرے دن کے اخباروں میں ہماری تصویر اور خبر بھی لگی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ گلیڈس کو رچرڈ کی بے وفائی کے غم کی بجائے تاریخ کا حصہ بن جانے پر زیادہ فخر تھا۔

''اچھا پھر کیا ہوا جب رچرڈ اسٹال لگانے میں جینی کی مدد کرنے لگا'' میں نے مزید

کہانی کے لئے کیو دیا۔

''میں اسی طرف آ رہی ہوں'' گلیڈس بولی۔ اسٹال لگانا اور بند کرنا تو میرے سامنے ہوتا تھا۔ ایسا کرتے وقت کبھی کبھار ان کی مسکراہٹوں کا تبادلہ میرے لیے کسی شک کا باعث نہ تھا کہ بہرحال کسی کی مدد کرتے وقت مسکرا دینا یہاں کا عام سماجی اور اخلاقی رویہ ہے۔ کئی بار جینی ہمارے گھر بھی آئی اور ایسی ہی کسی ملاقات میں اس نے میری اور رچرڈ کی تصویر پر وہ تحریر پڑھ لی اور بہت ہنسی۔ مجھے کہنے لگی ''Gladys, you have made history'' شاید اسے بھی رومن عہد میں خوبصورت لڑکیوں کی نیلامی کا علم تھا جو اس نے میرے بارے میں یہ جملہ کہا۔

یہ بات تو تاریخ عالم کا ہر طالب علم جانتا ہے میں نے لقمہ دیا۔ گلیڈس یہ بتاؤ کہ جینی رچرڈ کو کیسے لے اڑی۔ کرسمس کی شام تک تو میں نے تمہارے درمیان کوئی ایسی ویسی بیزاری نہیں دیکھی۔

بیزاری تھی اور کئی مہینوں سے چل رہی تھی۔ جب سے مجھے گنٹھیا ہوا اور وہیل چیئر پر جانے کا انکشاف ہوا رچرڈ اکیلا ہی مارکیٹ لگانے جاتا تھا اور ظاہر ہے جینی بھی وہیں اسٹال لگاتی تھی۔ مجھے تو جوزف نے یہ بھی بتایا کہ وہ مارکیٹ میں اس کی مدد کرنے کے علاوہ شہر اور قصبوں میں اپنے گھر کے یارڈ میں تفریحاً سیل لگانے والوں اور نقل مکانی کرنے والوں کی Moving Sale سے بھی اونے پونے داموں چیزیں خرید کر اسے فراہم کرتا تھا۔ میرے بھائی جوزف نے کئی بار انہیں اکٹھے یہ خریداری کرتے دیکھا اور محض اخلاقی تقاضا سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ وہ پچھلے کئی مہینوں سے دور دراز قصبوں میں مارکیٹ لگانے کے بہانے کئی کئی دن غائب رہتا تھا اور میں سمجھتی ہوں کہ جینی اس کے ساتھ جاتی ہوگی۔ ایسے ہی میل ملاپ میں ایک دن جینی نے فیصلہ کیا ہوگا کہ وہ رچرڈ کو خرید لے...... گلیڈس نے رچرڈ کا بھیجا ہوا خط ٹیبل سے اٹھا کر تاش کے پتے کی طرح دوبارہ ٹیبل پر پٹختے ہوئے غصے سے کہا ''اور اس نے ایسا کر دیا''۔

کہانی کے المناک انجام پر ہمارے دل گلیڈس کے لئے ہمدردی سے بھر گئے۔ ہم

خاموش تھیں گلیڈس بھی چپ ہوئی تو کمرے میں سناٹا سرسرانے لگا۔ کرسمس کے لئے سجایا گیا یہ نیم روشن کمرہ اس اتھاہ خاموشی میں کسی ایسے مقبرے کی طرح لگا جس کی تقریبات ابھی ابھی ختم ہوئی ہوں۔

''گلیڈس ڈیئر''میں نے خاموشی کو توڑا''اب تم کس طرح بسر کرو گی؟''

وہیل چیئر پر جانے سے پہلے پہلے میں یہ سارا سامان (اس نے چھڑی اٹھا کر کمرے میں گھمائی) گھر کے باہر یارڈ سیل پر لگا دوں گی۔ اس سے اپارٹمنٹ کا کرایہ اور یوٹیلٹی بل نکل آئیں گے۔ شاید کچھ جیب خرچ بھی نکل آئے۔

''اور اس کے بعد''میں نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔

اس کے بعد میں سوشل سروس کو فون کروں گی۔ وہ مجھے بے سہارا لوگوں کے نرسنگ ہوم چھوڑ آئیں گے۔

عمراں لنگھیاں پبّاں بھار

یہ بات اس وقت شروع ہوئی جب ملک ابھی تقسیم نہیں ہوا تھا۔ چوہدری اکبر نے اپنی ایک پھول والی وردی مہمان خانے میں دیوار پہ لگی کِلّی پر ٹانگی تو دیوار کے پار بہت سی آوازوں کے درمیان ایک کھنکتی ہنسی اُبھری اور اُن آوازوں کے درمیان کہیں گم ہوگئی۔

چوہدری اکبر وردی کِلّی پر ٹانگ کر دیوار کے برابر لگے اونچے رنگین پایوں والے پلنگ پر نیم دراز ہوگیا اور آنکھیں موند لیں۔

یہ مہمان خانہ ملک جعفر کی حویلی کا مردان خانہ تھا۔ ملک جعفر علاقے کا بڑا زمیندار اور گاؤں کا چوہدری تھا۔ گاؤں میں ہونے والے قتل کی ایک اندھی واردات کی تفتیش کے سلسلے میں اس علاقے کا تھانیدار چوہدری اکبر آج اُس کا مہمان تھا۔

گاؤں میں ہونے والے حادثے کا ملک جعفر نے ذاتی طور پر بہت اثر قبول کیا۔ گاؤں کے کوچوان کی جوان بیٹی کی لاش گاؤں کے کنویں سے ملی تھی۔

پورا گاؤں ایک خوف کی کیفیت سے دوچار تھا۔ واقعے کو چار دن ہو چکے تھے مگر ابھی تک کوئی سرا ہاتھ نہ آیا۔

دوپہر تک گاؤں کے بہت سارے لوگوں سے بات کرنے کے بعد چوہدری اکبر مہمان خانے میں آکر لیٹ گیا۔ ذہنی طور پر وہ بھی کافی پریشان تھا کہ ابھی تک کچھ بھی پتہ نہ چل

سکا۔ اسی سوچ میں وہ آنکھیں موندے لیٹا تھا کہ کھنکتی ہنسی سے ملتی جلتی آواز کانوں میں پھر سے پڑی۔

وہ پلنگ سے اٹھا اور کھڑکی کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ایک دفعہ تو جی میں آیا کہ کھڑکی کے پٹ چوڑ چوپٹ کھول دے اور اس کھنکتی ہنسی کا معمہ حل کر لے مگر پھر کچھ سوچ کر پرے ہٹ گیا کہ عین اسی وقت وہ آواز کانوں میں دوبارہ گونجی جو دوسری آوازوں سے بالکل مختلف تھی۔ اب کے اُس آواز میں کچھ جھنجھلاہٹ تھی جسے دوسری آوازوں نے دبالیا۔ چوہدری اکبر پھر پلٹ کر کھڑکی کی طرف آیا اور کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھائے مگر پھر ہاتھ واپس کھینچ لیے۔ وہ پلٹا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا، آہستگی سے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا دی۔ پلٹ کر کھڑکی کھولنا چاہی مگر اُسے اندر سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا، سو اس نے کھڑکی کھولنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کھڑکی کے چاروں طرف گہری نگاہ ڈالی، کوئی درز، کوئی روزن؟

اُس کی انگلیاں کھڑکی کے تختوں پر سرسرانے لگیں۔ ہاتھ کے ہلکے سے دباؤ پر کھڑکی کے دونوں پٹ باہر کی طرف سرک گئے اور درمیان میں لمبی سی درز بن گئی۔

چوہدری اکبر نے بے تابی سے اپنا ماتھا کھڑکی کے پٹوں پر ٹکا دیا اور آنکھیں جھپک جھپک کر باہر کے منظر کو مرتب کرنے لگا۔ چند لمحوں بعد جب آنکھیں اس منظر کو ترتیب دے پائیں تو وہ کچھ یوں تھا۔

ایک وسیع احاطہ یا صحن جس کے بیچوں بیچ رسی ایک سرے سے غالباً دوسرے سرے تک تنی ہوئی تھی اور اُس پر کچھ کپڑے بے ترتیب انداز میں سوکھنے یا دھوپ لگوانے کے لیے ڈالے گئے تھے۔ کھڑکی کے سامنے والے حصے پر سفید اور کالی ڈبیوں والا کھیس تنا ہوا تھا جو زمین سے کچھ اوپر تک لٹک رہا تھا۔ کھیس کے نیچے سے اور اردگرد جو نظر آیا وہ تازہ چنی ہوئی کپاس کا ڈھیر اور اس کے پاس کھڑی وہ عورتیں جو صرف دھڑ سے نیچے نیچے نظر آ رہی تھیں کیونکہ تار پر ڈلے چھوٹے بڑے کپڑوں نے اُنھیں نصف سے زیادہ چھپا رکھا تھا۔ ڈھیر کے ایک طرف اور تار پر کھیس کے عین سامنے رنگین پیڑھے پر یقیناً وہ کھنکتی ہنسی والی بیٹھی تھی جس کی چھینٹ کی پھولوں والی سرخ شلوار اور

مہندی سے رچے دودھیا پاؤں کھیس کی اوٹ سے نظر آ رہے تھے۔

چوہدری اکبر کی نظریں اس کے مہندی والے دودھیا پاؤں پر جم گئیں۔

اُسے اپنی وہ سفید کبوتری یاد آ گئی جس کے پروں پر وہ نشانی کے لیے زردہ رنگ لگا دیتا تھا تا کہ وہ اس کے تایازاد افضل کے کبوتروں میں شامل نہ ہو جائے۔

چوہدری افضل اُسے اکثر چھیڑتا کہ تو کبوتری پر رنگ نشانی کے لیے نہیں بلکہ اُس کے سنگھار کے لیے لگاتا ہے، تو اس پر عاشق ہے۔

مگر چوہدری اکبر ہمیشہ ہنستے ہوئے اُس کی تردید کر دیتا، لیکن آج یہ مہندی رچے سفید دودھیا پاؤں دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ وہ شاید واقعی کبوتری کو سنگارنے کے لیے رنگ لگاتا تھا۔

جانے وہ کب تک کھڑکی کے پٹوں سے ماتھا ٹکائے کھڑا رہا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ چونک کر پلٹا اور دروازہ کھول دیا۔ سامنے درمیانی عمر کا ایک شخص ہاتھ میں کھانے کی ٹرے (جو کروشیے کی جالی دار رومال سے ڈھکی تھی) لیے معذرت خواہانہ انداز میں کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے بارہ تیرہ سال کا لڑکا پیتل کا چمکتا جگ اور گلاس لیے اندر داخل ہوا۔

او جی معاف کرنا تھانیدار صاحب کھانے میں تھوڑی دیر ہو گئی۔

میز پر کھانا رکھتے ہوئے وہ بولا۔

لگتا ہے آنکھ لگ گئی تھی؟

چوہدری اکبر ایک دم چونک گیا۔ نہیں بس ایسے ہی لیٹا تھا۔

دراصل جی ملک صاحب نے آپ کے لیے خاص کھانا تیار کرایا ہے۔ کھانے میں دیر کی وضاحت کرتے ہوئے اُس نے لڑکے کے ہاتھ سے جگ اور گلاس لے کر اُسے واپس جانے کا اشارہ کیا اور خود پلنگ کے پاس پڑے موڑھے پر بیٹھ گیا۔

کھانا دیکھ کر چوہدری اکبر کو احساس ہوا کہ اُسے واقعی بھوک لگی ہے۔ وہ کھلے دروازے کے باہر جھانکنے لگا۔

کیا چاہیے جی؟......کھانا لانے والے نے پوچھا۔

غُسل خانہ کدھر ہے؟

ہاتھ دھونے ہیں تو جی میں پانی اور چلمچی یہیں لے آتا ہوں۔

نہیں مجھے غُسل خانے بھی جانا ہے چوہدری اکبر نے جواب دیا۔ وہ دانستہ باہر جانا چاہتا تھا تا کہ وہ اندازہ کر سکے کہ یہ مہمان خانہ کیا اُسی دالان کا حصہ ہے جہاں سے ابھی تک وہ آوازیں اور کبھی کبھار کھنکتی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔

وہ بشیرے (جس کا نام اُسے دوپہر میں ہی معلوم ہوا تھا) کے پیچھے پیچھے باہر نکلا، دوپہر جن لوگوں سے تفتیش ہوئی ان میں بشیرا بھی شامل تھا اور بقول ملک جعفر کے کئی پشتوں سے بشیرے کا خاندان اُن کا وفادار تھا اور نسل در نسل یہ وفاداری بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے ملک جعفر بشیرے کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ وہ واحد ملازم تھا جو حویلی کے زنان خانے میں بے دھڑک چلا جاتا، اُس سے کوئی پردہ نہ تھا۔

مہمان خانے کے سامنے کھلا صحن جس کے ایک طرف کونے میں غسل خانہ اور ساتھ ہی ہینڈ پمپ لگا تھا۔ جب کے دوسرے کونے پر نیم کا گھنا درخت جس کے نیچے چارپائی اور موڑھے رکھے تھے۔ برآمدے میں مہمان خانے والے کونے کی بغل میں ایک بند دروازہ تھا جو یقیناً اسی دالان میں کھلتا تھا جس کے ادھورے منظر نے اُس کے اندر ایک ہلچل مچادی تھی۔ غُسل خانے سے واپسی پر اُس کی نظریں دروازے پر ہی ٹھہری رہیں جسے بشیرے کی تجربہ کار آنکھوں نے بھانپ لیا مگر وہ سمجھ نہ پایا۔ اس کا خیال تھا کہ تھانیدار صاحب تفتیشی نگاہ سے ہر چیز کا جائزہ لے رہے ہیں۔

اوہ جی یہ دروازہ حویلی کے اندر کھلتا ہے جو ملک صاحب کے بچوں کا رہائشی حصہ ہے......اُس نے وضاحت کرنا اپنا فرض سمجھا کہ اُس دروازے یا دروازے کے پیچھے کے حصے کو کسی بھی طرح اُس حادثے سے نہ جوڑا جائے۔ اُس نے اپنے بڑوں سے سُن رکھا تھا کہ پولیس والا کسی کا سَگا نہیں ہوتا اور کبھی تو وہ اپنے آپ کو بھی شک کے دائرے سے باہر نہیں رکھتا، سو وہ اپنی

سادگی میں حویلی اور اُس کے مکینوں کا دفاع کر رہا تھا۔

کھانا ختم ہونے پر بشیرا برتن سمیٹ کر جانے لگا تو چوہدری اکبر نے اُسے روک لیا۔

تم تھوڑی دیر رکو...... کچھ پوچھنا ہے تم سے۔

برتن سمیٹتے ہوئے بشیرے کے ہاتھ کپکپانے لگے۔

مجھ سے جی؟

ہاں تم سے...... چوہدری اکبر نے سخت لہجے میں کہا۔

وہ برتن وہیں رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

بیٹھ جاؤ! چوہدری اکبر نے لہجے کو ذرا نرم کیا۔ اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حویلی کے اندر کے حالات سے واقفیت کے لئے بشیرے سے زیادہ مناسب اور کوئی نہیں۔ اُس نے اپنے تجربے کی روشنی میں بالکل صحیح تیر پھینکا تھا۔

بشیرا دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اُس کا حلق خشک ہونے لگا۔ چوہدری اکبر کو اُس کی حالت پر ترس آ گیا۔

چل تھوڑی لسّی اور پلا!...... اُس نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کے لیے دوستانہ لہجے میں کہا۔

بشیرے نے حیرت سے اُس کو دیکھا اور لسّی کا گلاس بھر کے اُس کے سامنے رکھ دیا۔

ٹھنڈی لسّی کا اپنا ہی مزہ ہے...... چوہدری اکبر نے لسّی کا گلاس ختم کر کے منہ صاف کیا۔

اور دوں جی؟...... بشیرے کے حلق سے قدرے بہتر آواز نکلی۔

نہ بس...... چوہدری اکبر نے لگاوٹ اور تکلّف سے کہا۔

بشیرے کی جان میں جان آئی ورنہ جانے وہ کیا سمجھ بیٹھا تھا۔

چوہدی اکبر پلنگ پر نیم دراز ہو گیا اور کچھ سوچنے کے بعد بشیرے سے پوچھا۔

تو کب سے ملک صاحب کے پاس ہے...... اس کی نظریں پھر کھڑکی پر جمی تھیں اور اب تفتیش کا رُخ کسی اور ہی طرف مڑ گیا۔

کوئی گھنٹے بھر کے بعد بشیرا جب مہمان خانے سے برتن لے کر باہر آیا تو اُس کے چہرے پر خوف یا تناؤ ہرگز نہ تھا۔ بلکہ اُس کے دل میں تھانیدار کے لیے ممنونیت پیدا ہوگئی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اب رفیق کو جوان کی بیٹی کے اندھے قتل کا سراغ ضرور مل جائے گا مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ تفتیش ایک نیا رُخ اختیار کر چکی ہے۔

بشیرے کے جانے کے بعد چوہدری اکبر اطمینان سے آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ ملک جعفر چار بیٹوں اور ایک چہیتی بیٹی کا باپ تھا۔ بیوی بیٹی کی پیدائش پر چل بسی تھی۔ تو وہ کبوتری سے پیروں والی ملک کی بیٹی ہے۔ ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور وہ کروٹ لے کر سو گیا۔

اگلے دن وہ دوپہر تک مصروف رہا، مختلف لوگوں سے ملا جن میں ملک جعفر کے بیٹے بھی شامل تھے۔ چوہدری اکبر کو اندازہ ہو گیا کہ ملک جعفر کو اپنی ملکیت اور جائیداد سے زیادہ اولاد سے محبت ہے۔ بیٹے بھی آنکھ اٹھا کر باپ کو نہ دیکھتے۔ وہ اپنی اولاد پر نازاں تھا۔

وہاں سے فارغ ہو کر جب اپنے وہ گاؤں پہنچا تو دِن ڈھل چکا تھا۔ اپنی سفید گھوڑی سے اتر کر وہ حویلی کے صحن میں داخل ہوا تو مغرب سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ بلقیس صحن میں چولہے پر روٹی پکا رہی تھی۔ چوہدری اکبر کو دیکھ کر اُس کے سانولے چہرے کی رنگت اور تپش میں اضافہ ہو گیا۔ وہ بے نیازی سے اُسے بنا دیکھے ہی قریب سے گزر کر برآمدے کی طرف بڑھا۔ بلقیس نے سر مزید جھکا کر آٹے کے دو پیڑے اور نکال لیے۔

برآمدے میں لالٹین جلاتی بے جی بیٹے کو یوں اچانک آتا دیکھ کر خوش سے زیادہ حیران ہوئیں کیونکہ اکبر مہینے میں شاید ہی دو دفعہ گھر کا چکر لگاتا اور بے جی کے محبت بھرے شکووں کے جواب میں بڑے فخر سے کہتا ''بے جی تیرا پتر سرکار کا ملازم ہے جس کی وردی پر ایک پھول بھی ٹنگا ہے۔

بے جی نے اکبر کو اپنی طرف آتا دیکھا تو اُن کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ آگے بڑھ کر ماں سے لپٹ گیا۔

خیر تو ہے پتر آج تو دو دن بعد ہی آ گیا۔ کہاں مہینے میں مشکل سے دو دفعہ شکل دکھاتا تھا۔

کیا ہو گیا بے جی..... کیا میں اپنے گھر میں ایسے نہیں آ سکتا؟

نہیں پُتر جم جم آ..... سدا آ۔ میں تو بس پوچھ رہی تھی کہ سب خیر ہے ناں؟

سب خیر ہے بے جی۔ کل سے ساتھ والے پنڈ آیا ہوا تھا تفتیش کے سلسلے میں۔ سوچا واپسی پر آپ اور میاں جی سے بھی مل لوں، کہاں ہیں میاں جی؟

اپنے کمرے میں نماز کی تیاری کر رہے ہوں گے بے جی نے اُس کی آنکھ میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ وہ جاننا چاہتی تھیں کہ کیا اُن کا بیٹا واقعی سچ بول رہا ہے۔ بے جی کو اس طرح دیکھتا پا کر وہ میاں جی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور بے جی کا دھیان صحن میں چولہے کے آگے بیٹھی اپنی بہو بلقیس کی طرف چلا گیا جو سر جھکائے ہمیشہ کی طرح اردگرد سے لاتعلق انگاروں کو گھور رہی تھی۔ بلقیس اُن کی بھتیجی تھی جو تین سال پہلے اُن کے اکلوتے بیٹے چوہدری اکبر کی مرضی کے خلاف صرف بے جی کی خوشی اور مرضی سے اُن کی بہو بن کر حویلی آئی تھی۔ میاں جی نے بہت سمجھایا کہ جب بیٹا راضی نہیں تو کیوں یہ قدم اٹھاتی ہو۔ مگر بے جی کا ایک ہی جواب..... میری یتیم بھتیجی ہے اگر آج میں ہی اسے سہارا نہ دوں تو باہر سے کون پوچھے گا؟

بے جی کی ضد پر اکبر نے اس شرط پر بلقیس سے شادی کی کہ اگر وہ چاہے بلکہ جب چاہے اپنی مرضی سے دوسری شادی کر سکتا ہے اور پھر وہ اس گھر میں چوہدری اکبر کی مرضی کے خلاف بے جی کی بہو بن کر آ گئی۔ وہ اس کے گھر میں تو آ گئی مگر رکھی ہی رہ گئی۔ اُسے یہاں کسی نے نہ پوچھا سوائے بے جی کے۔ میاں جی تو ویسے ہی کم گو اور گھریلو معاملات سے دور رہتے۔ اُنھیں بلقیس سے ہمدردی تھی کیونکہ وہ اُن کے بیٹے کے دل کے کبھی قریب نہ آ سکی۔

تین سال کے بعد بھی اولاد کا نہ ہونا بے جی کو پریشان کرتا مگر وہ جانتی تھیں کہ بلقیس کا اس میں قصور نہ تھا۔ اکبر شاید ہی تین سالوں میں تین دفعہ بیوی سمجھ کر بلقیس کے پاس گیا ہوگا۔ وہ دونوں ہی ایک دوسرے سے بے نیاز بے جی کی خوشی کے لیے اس رشتے سے بندھے چلے آ رہے تھے۔ یہ بات تو بے جی بھی مانتی تھیں کہ بلقیس اُن کے بیٹے کا جوڑ نہ تھی۔ گورا چٹا چھ فٹ سے نکلتے

قد کا خوبرو اکبر کسی بھی طرح گہرے سانولے رنگ، درمیانے قد اور موٹے موٹے ہاتھ پیروں والی بلقیس کے قابل نہ تھا۔ بس بھائی کی محبت نے اُن سے یہ بے جوڑ فیصلہ کروا دیا۔

اکبر نے کہا کہ وہ صرف ملنے آیا ہے مگر بے جی کا دل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ لہٰذا کسی ان دیکھے خوف کے پیش نظر وہ کھانے کی طشتری خود ہی اٹھا کر کمرے میں لے گئیں۔ سر جھکا کر بیٹھی بلقیس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور دہکتے کوئلوں پر گر کر اُسے بھی بھسم کرنے لگے۔

بے جی کا خوف درست تھا۔ وہ جب کھانا لے کر کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ میاں جی کے پاؤں دبا رہا تھا اور خاموش تھا۔ کھانا بھی اُس نے بے دلی سے کھایا۔ بے جی کے ساتھ میاں جی کی تجربہ کار آنکھوں نے بھی محسوس کرلیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔

بلقیس رات بھر بھاری رضائی میں ہمیشہ کی طرح اکیلی ٹھٹھرتی رہی، اذان کی آواز کے ساتھ ہی اس نے رضائی ایک طرف پھینکی اور کمرے سے باہر آ گئی۔

بے جی صبح وضو کے لیے پانی گرم کرنے آئیں تو دیکھا بلقیس چکی پیس رہی ہے۔ چکی تو وہ اکثر صبح اٹھ کر پیستی خاص طور پر ان دنوں جب اکبر گھر آتا۔ مگر آج وہ اپنے اردگرد سے بے نیاز چکی کا پاٹ تیزی سے گھما رہی تھی۔ بے جی کے لیے اس کی رات بھر کی اذیت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔

روٹی پکاتے ہوئے آج اُس نے اکبر کے پراٹھوں میں زیادہ مکھن لگانے والی بے ایمانی بھی نہ کی۔

ناشتہ تیار کر کے اُسے جلدی جلدی طشتری میں رکھا اور جانے کیا سوچ کے بے جی کے آنے سے پہلے خود ہی میاں جی کے کمرے کی طرف چل دی۔

ناشتے کی طشتری میز پر رکھتی ہوئی بلقیس کی سانولی رنگت والی چھالوں بھری ہتھیلیاں دیکھ کر ندامت کا شدید احساس بے جی کے اندر تک اتر گیا۔ اُنہوں نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح کو اس طرح زور سے دبایا کہ تسبیح کے دانے آبلوں کی طرح اُن کی ہتھیلی پر چبھنے لگے۔

بلقیس خاموشی سے ناشتہ رکھ کر چلی گئی۔ بے جی کی نظریں بے اختیار اپنی پائنتی کی طرف سوئے ہوئے بیٹے پر جا ٹکیں جو شاید تین سال کے بعد اتنی پُر سکون اور گہری نیند سویا تھا۔ میاں جی بھی ایسی ہی صورت حال سے دوچار تھے جس نے بے جی کو پریشان کر دیا تھا۔ اُن کی نظریں بے جی کے چہرے پر ٹھہر گئیں اور وہ بنا بولے ہی بے جی سے پوچھ رہے تھے کہ اب کس کی محبت میں مجبور ہو کر یہ نیا فیصلہ کرنے جا رہی ہو؟ جواب میں بے جی نے سر جھکا دیا۔

دوپہر کو جب چوہدری اکبر دوبارہ ماکاں والے پنڈ پہنچا تو میاں جی اور بے جی بھی اُس کے ساتھ تھے۔

ملک جعفر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی بڑی گرم جوشی اور احترام سے مہمانوں کا استقبال کیا اور جب نظر جھکا کر دھیمی آواز میں میاں جی نے ملک جعفر کے سامنے اپنے بیٹے کے لیے دامن پھیلایا تو اُس کے برابر بیٹھے اُس کے چاروں بیٹے طیش میں آ گئے۔ اُن کی زندگی میں سب سے قیمتی شے اُن کی بہن تھی اور کسی اجنبی کا یوں جرأت کرنا انہیں سخت ناگوار گزرا۔

ملک جعفر نے اُنہیں خود کو سنبھالنے کے لیے کہا۔ اور خود میاں جی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولا۔

میاں جی آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ آپ جیسا وضعدار آدمی جھولی پھیلائے، سوال کرے مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت دیں۔

اور پھر دیئے گئے وقت میں پتہ نہیں کیا کیا ہوا۔ نہ ہی ملک جعفر کے بیٹے باپ کی بات ماننے کے لیے تیار تھے اور نہ ہی ملک اکبر کا دل نہ سننے کے لیے۔

ملک جعفر نے بیٹوں کو سمجھایا کہ آخر اس پر سوچنے میں کیا حرج ہے۔ میاں جی کی شرافت اور نیک نامی، چوہدری اکبر کا خُوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھا لکھا اور ذمہ دار افسر ہونا، یہ تمام چیزیں یکسر ''نہ'' کا حق نہیں رکھتی تھیں۔ وہ جہاندیدہ آدمی تھا۔ بیٹوں کی مخالفت کے باوجود اُس نے فیصلہ چوہدری اکبر کے حق میں دے دیا۔

اور پھر جاتی سردیوں کے دن تھے جب خورشید ڈولی میں بیٹھ کر چوہدری اکبر کے ویہڑے جا اتری۔

خورشید بے جی کے سہارے ڈولی سے نکلی اور سنبھل کر چوہدری اکبر کے پہلو میں کھڑی ہوگئی۔ چوہدری اکبر کی نظر بے اختیار اُس کے مہندی والے پیروں پر جا ٹھہری۔ جو سنہرے طِلّے والی گُرگابی میں دمک رہے تھے۔ اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اُس کے پہلو میں کھڑی، سرخ پھلکاری کے گھونگھٹ میں چھپی کیسی ہے؟ بس وہ تو اس ویہڑے کی طرح اپنے دل کو بھی خوش نصیب سمجھ رہا تھا جس پر خورشید کے سفید دودھیا مہندی رچے پاؤں جمے تھے۔

بے جی نے دہلیز پر تیل گرایا اور پھر چاندی کی گڑوی میں ٹھنڈا دودھ اُن دونوں کے سر سے وار کر پیا، مگر برآمدے میں کھڑی لاتعلق سی بلقیس کی شاکی نظریں انگارے کی طرح اُس ٹھنڈک کو جھلسا گئیں۔ وہ بوجھل قدموں سے دوسری عورتوں کے ساتھ خورشید کو سہارا دے کر صحن کے بیچوں بیچ چلتی ہوئی اُس کمرے کی طرف بڑھیں جو چوہدری اکبر نے خود خورشید کے لیے سجایا تھا کہ اچانک بلقیس تیزی سے آگے بڑھی اور بڑی خوشدلی سے خورشید کو تھام کر کمرے میں لے گئی، آرام سے سہارا دے کر پلنگ پر بٹھایا، طلے والی گُرگابی اس کے پیروں سے اتار کر بڑے گول سرہانے سے ٹیک لگا کر اُسے بٹھا دیا اور سرخ شنیل کی رضائی اُس کے گھٹنوں پر ڈال دی۔ خورشید پھلکاری میں گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ بلقیس کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ اُس کے سر سے پھلکاری اتارنے لگی۔ پھلکاری اتارتے ہوئے اُس کا سرخ گوٹے والا دوپٹہ بھی سر سے سرک گیا۔

خوردشید نے سر کو مزید جھکا دیا۔ سیاہ بالوں کے درمیان سیدھی کھینچی سفید مانگ سر کے پیچھے تک جا پہنچی تھی۔ بلقیس نے ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اُوپر اٹھایا، سفید گورا رنگ جو اُس وقت گلابی ہو رہا تھا، سُرمے سے بھری بادامی آنکھیں اور بھرے بھرے گلابی ہونٹ......ایک لمحے کے لیے جیسے سچ مچ بلقیس کی سانس رُک گئی۔ اُسے لگا جیسے چانن سارے کمرے میں پھیل گیا، ہو وہ

چپ چاپ کچھ دیر اُسے دیکھتی رہی۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر بولی!

میں بلقیس ہوں۔۔۔۔ بے جی کی بڑی بہو۔ اُس نے خورشید کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا!۔۔۔۔ میں صرف بے جی کی بہو ہوں کیونکہ چوہدری اکبر نے تو آج تک مجھے اپنی بیوی نہیں سمجھا۔

خورشید نے پہلی دفعہ نظر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی بلقیس کو دیکھا، گہری سانولی رنگت، تیکھے نین نقش والی سیدھی سادھی بلقیس۔ خورشید کو ایک ہی پل میں اُس سے ہمدردی ہوگئی۔ اُسے بلقیس کی آنکھوں میں نمی تیرتی ہوئی نظر آئی۔ خورشید کو یوں اپنی طرف دیکھتا پا کر بلقیس تھوری کھسیانی ہو کر بولی چل اچھا ہی ہوا جو چوہدری اکبر نے مجھے اپنی بیوی نہیں سمجھا ورنہ تو میری سوکن ہوتی...... جب چوہدری ہی مجھے بیوی نہیں سمجھتا تو تُو کیسے میری سوکن ہوگئی؟ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

بس میں بے جی کی بڑی بہو اور تو چھوٹی بہو۔

خورشید حیرت سے بلقیس کو دیکھ رہی تھی جو بچوں کی سی معصومیت سے آپ ہی آپ نئے پرانے رشتوں کو جوڑ رہی تھی۔ خورشید کے دل کا بوجھ بڑھ گیا۔ بلقیس نے اُس کی پھلکاری تہہ کر کے ایک طرف رکھ دی اور گوٹے والے سرخ دوپٹے کا گھونگھٹ کھینچ کر لمبا کر دیا، کمرے کے پیچھے لگے سرہانے کو ٹھیک کرتے ہوئے بولی!

اب میں چلتی ہوں چوہدری اکبر آتا ہی ہوگا۔

وہ دروازے کے پٹ آہستہ سے بند کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی مگر خورشید کا دھیان دروازے پر ہونے والی آہٹ کی بجائے کسی اور طرف چلا گیا۔

دو چار دن بعد خاموشی سے ہونے والی اس شادی کی رسمیں بھی ختم ہوگئیں۔ خورشید کے آنے کے بعد چوہدری اکبر اکثر گھر آنے لگا، بیٹے کو خوش دیکھ کر بے جی مطمئن سی ہوگئیں، اور وہ تو خورشید کا ساتھ پا کر اس قدر نہال تھا کہ جانے خورشید سے کیا کیا وعدے کر بیٹھا۔ اگرچہ سب وعدوں کو

نبھانا اُس کے لیے مشکل تھا مگر وہ خورشید کی کوئی بھی بات نہ ٹال سکا۔ ایک دن بے.جی سویرے اپنے کمرے سے نکلیں تو دونوں بہوؤں کو اکٹھا چکی پیستے، ہنستے کھلکھلاتے دیکھ کر بے حد خوش ہوئیں۔

انہوں نے غور سے بلقیس کے سانولے چہرے پر نگاہ ڈالی جہاں پہلی دفعہ انہیں سکون اور سرشاری محسوس ہوئی۔ جانے کیوں انہیں یقین ہونے لگا کہ اب چکّی پیستے ہوئے اُس کی ہتھیلیاں چھالوں سے زخمی نہیں ہوں گی۔ وہ دنوں بے.جی کی آمد سے بے خبر آپس میں مگن چکّی پیستی رہیں اور وہ اُنہیں سدا سہاگن رہنے کی دعا دیتے ہوئے دالان کی طرف چل دیں۔ پھر وہ دن بھی آ گیا جب بلقیس نے گول مٹول سے بیٹے کو جنم دیا۔ خورشید نے اُسے بلقیس کے پہلو سے اٹھا کر سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ اور پھر چوم کر چوہدری اکبر کی گود میں ڈال دیا۔ چوہدری نے اک نگاہ بلقیس اور خورشید کے چہروں پر ڈالی تو اُسے بلقیس کی آنکھوں میں فخر اور خورشید کی آنکھوں میں تشکر نظر آیا۔ ایک لمحے کے لیے وہ خورشید کا احسان مند ہو گیا اور محبت بھری نظروں سے خورشید کو دیکھنے لگا۔ بلقیس کو آج پہلی بار چوہدری کا خورشید کو یوں دیکھنا بُرا لگا۔ خورشید نے بچہ چوہدری اکبر سے لے کر جب بے.جی کی گود میں ڈالا تو بے.جی نے پہلے خورشید کا ماتھا چوم کر اُسے سینے سے لگا لیا۔

اس کے بعد اوپر تلے بلقیس نے ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کو اور جنم دیا، خورشید ہر بچے کی پیدائش پر نہال ہو جاتی اور بچے بھی چھوٹی ماں کے پیچھے پیچھے پھرتے۔ خورشید کی خالی گود بے.جی کو دکھی کرتی مگر وہ اسے اپنے رب کی مصلحت سمجھ کر خاموش ہو جاتیں۔ بلقیس تو بچوں کو جنم دے کر اپنا فرض پورا کر لیتی مگر اُن کی پرورش کی ذمہ داری صرف خورشید کے کندھوں پر ہوتی ہے۔ اور وہ بھی بچوں میں ایسی مگن رہتی کہ اُسے اپنے خالی کوکھ کا خیال ہی نہ آتا۔ چوہدی اکبر کے یہ بچے اُسے اپنی کوکھ کا ہی حصہ محسوس ہوتے۔ اب چوہدری اکبر کے مزاج میں بھی ٹھہراؤ آ گیا خاص طور پر بیٹیوں کی پیدائش کے بعد اُس کی جذباتی زندگی میں بھی وہ دیوانگی باقی نہ رہی۔

وقت تیزی سے گزرنے لگا۔ میاں.جی اور بے.جی ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو گئے کہ اچانک فسادات کی آگ بھڑک اٹھی اور ملک بٹوارے کی طرف بڑھنے لگا۔ بے تحاشا خون

بہانے کے بعد ملک میں بٹوارے کے لیے لکیر کھینچ دی گئی۔ یہ خونی لکیر سرحد پار کرنے والوں کے لیے پُل صراط سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوئی۔

چوہدری اکبر سرکار کا ملازم تھا۔ بٹوارے کے وقت وہ جس علاقے میں تعینات تھا وہ علاقہ سرحد پار نئے ملک کا حصہ ٹھہرا۔ بلقیس بھی اس وقت اپنے دنوں بیٹوں کے ہمراہ چوہدری اکبر کے ساتھ تھی جبکہ خورشید دونوں بچیوں کے ساتھ گاؤں میں۔

تقسیم کے بعد جب خورشید نے بچیوں کے ہمراہ چوہدری اکبر کے پاس جانے کی تیاری شروع کی تو اُس کے بھائیوں نے اُسے روکنا چاہا۔ وہ خورشید کے پہلے فیصلوں سے بھی زیادہ خوش نہ تھے مگر یہ فیصلہ انھیں ہرگز قبول نہ تھا مگر بھائیوں کی تمام تر محبت اور مخالفت کے باوجود خورشید نے آخری مرتبہ ڈبڈباتی آنکھوں سے بھائیوں کو دیکھا اور دونوں بچیوں کا ہاتھ تھام کر سرحد پار کر گئی۔

خورشید بڑے مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ نئے ملک اور نئی جگہ پر اُس نے بڑے حوصلے اور ہمت سے چوہدری اکبر کا ساتھ دیا۔ اُس کی موجودگی چوہدری اکبر کو بہت حوصلہ دیتی۔ اولاد سے اُس کی محبت اکثر چوہدری اکبر اور بلقیس کو حیران کر دیتی مگر تمام تر حسد اور جلاپے کے بلقیس ہمیشہ اس یقین کے ساتھ خاموش رہتی کہ آخر اولاد تو میری ہے۔ وہ اب پہلے والی بلقیس نہ تھی جو ایک فالتو چیز کی طرح چوہدری اکبر کے گھر کے کسی کونے میں پڑی رہتی۔ آج وہ اُس کے چار بچوں کی ماں تھی اور چوہدری اکبر کے گھر کی اصل مالک۔ مگر آج بھی اُس کی شدید ترین خواہش چوہدری اکبر کی منظورِ نظر ہونا تھی۔ اب وہ ہرگز نہ چاہتی تھی کہ چوہدری اکبر ایک لمحے کے لیے بھی خورشید کی طرف دیکھے۔ اس لیے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے بچوں کے ساتھ مصروف رکھتی۔ خورشید نے بھی خود بخود گھر اور بچوں کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں تھیں اور بلقیس نے چوہدری اکبر کی۔ وہ چوہدری اکبر کے آنے پر اس طرح تیار ہوتی اور کوشش کرتی کہ چوہدری اکبر چاہتے ہوئے بھی خورشید کی طرف نہ دیکھے۔ چوہدری اکبر جانتا تھا کہ خورشید کو سفید موتیے کے گجرے بہت پسند ہیں اور جو مہندی کے علاوہ اس کا واحد سنگھار تھے۔ اس لیے وہ ہمیشہ گھر آتے ہوئے اس

کے لیے گجرے لے کر ضرور آتا۔ لیکن بچے اب بڑے ہو رہے تھے اور یہ سب کرتے ہوئے خورشید کو جھجک محسوس ہوتی۔

وہ بڑی محبت کے ساتھ چوہدری اکبر سے گجرے لیتی اور صحن میں گھڑونچی پر رکھی صراحی کے گلے میں ڈال دیتی۔ اُسے سفید رنگ بہت پسند تھا اور اب تو وہ زیادہ تر سفید لباس ہی پہنتی جو اُس پر بہت جچتا۔ مگر چوہدری اکبر کی آمد پر وہ اپنے سفید دوپٹے کو چپکے سے زردہ رنگ سے بسنتی رنگ لیتی تو سکول سے واپسی پر جب بچے رسی پر جوگیا دوپٹہ جھولتا دیکھتے تو اُنہیں اندازہ ہو جاتا کہ آج باپ گھر آ رہا ہے۔

دن تیزی سے گذرتے رہے، چوہدری اکبر ریٹائر ہو گیا۔ دونوں بیٹیاں بیاہ کر اپنے گھروں کو جا چکیں اور دو ڈولیاں بہوؤں کو لے کر آنگن میں اتریں۔ خورشید نے جس طرح بیٹوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی ویسے ہی وہ بہوؤں کو نئے گھر اور نئے ماحول میں ڈھلنے کے لیے مدد کر رہی تھی۔ وہ ان کی ساس سے زیادہ سہیلی نظر آتی جبکہ بلقیس ایک روایتی ٹھسے دار ساس کے روپ میں ان پر حکم چلاتی۔ بلقیس کو بہوؤں کا خورشید کے ساتھ یوں گھلنا ملنا زیادہ پسند نہ تھا۔ وہ خاموشی مگر ناگواری سے سب دیکھتی اور برداشت کرتی۔ اُسے محسوس ہوتا کہ اب اُس کے دل میں خورشید کے لیے جگہ کم پڑ گئی ہے۔ حالانکہ اُس نے خود پہلے ہی دن خورشید کے سامنے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ اُس کی سوکن نہیں ہے۔ لیکن شاید اُس وقت وہی سچ تھا کیونکہ بلقیس اُس وقت صرف بے.جی کی بہوٹھی چوہدری اکبر کی بیوی نہیں۔ اور آج جب وہ چوہدری کی بیوی اور اُس کے بچوں کی ماں تھی تو اب خورشید واقعی اسے سوکن لگتی۔ وہ بات بے بات اُس سے الجھ پڑتی مگر خورشید یہ سب خوشدلی سے برداشت کر لیتی۔ چوہدری اکبر بھی بلقیس کے رویے کو محسوس کرتا اور یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا کہ یہ فطری رویہ ہے۔ اب اس عمر میں وہ کسی جھگڑے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر خورشید نے بھی تو کبھی شکایت نہ کی تھی سو جیسے چل رہا تھا چلتا رہا۔ خورشید کے لیے بلقیس کے دل کی کڑواہٹ اب زبان پر آنے لگی تھی جسے بچے بھی محسوس کرتے اور اکثر ماں سے اُس کے رویے پر احتجاج کرتے

کیونکہ چھوٹی ماں اُنھیں بے حد عزیز تھی۔ یہی چیز بلقیس کے لیے نا قابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کے بیٹوں اور بیٹیوں کی طرح بہوئیں اور داماد بھی چھوٹی ماں کے گرویدہ تھے۔ وہ دل ہی دل میں اس صورت حال پر کڑھتی۔ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا کہ اپنی اولاد خورشید کو سونپ کر اُس نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب تو اُس کے نواسے نواسیاں اور پوتیاں بھی چھوٹی دادی کی گود کو ترجیح دیتیں۔ چوہدری اکبر خاموشی سے سب دیکھتا رہتا۔ بظاہر وہ ایک مطمئن زندگی گذار رہا تھا۔

بیٹے بیٹیاں اپنے گھروں میں آباد اور فرمانبردار تھے۔ مگر ایک خیال اُسے اکثر پریشان کرتا اور وہ تھا اُس کے بیٹوں کے ہاں اولاد نرینہ کا نہ ہونا۔ بڑے بیٹے کے ہاں تو اوپر تلے چار بیٹیاں پیدا ہوگئیں مگر چھوٹی بہو کی گود اب تک خالی تھی۔ بلقیس نے کچھ سالوں بعد ہی چھوٹے بیٹے پر دوسری شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا مگر وہ آمادہ نہ ہوا اور روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آکر علیحدہ ہو گیا۔

اب بلقیس کی واحد امید بڑی بہو تھی۔ چھوٹے بیٹے سے مایوس ہو جانے کے بعد اُس نے بڑی بہو کا جینا حرام کر دیا کہ اب خاندان کو وارث دینا اُس کی ذمہ داری ہے۔ اس صورت حال نے گھر میں کشیدگی کی فضا پیدا کر دی۔ بڑی بہو ساس کی فرمائش پوری نہ ہونے پر پریشان رہنے لگی۔ ایسے میں خورشید اپنی بہو کے لیے ڈھال بن گئی۔

پھر ایک ایسا حادثہ ہوا جس کا تصور شاید گھر میں کسی نے نہ کیا تھا۔ چاند رات تھی، چوہدری اکبر کے گھر میں ایک پُر رونق ہنگامہ برپا تھا۔ دونوں بیٹیاں اپنے بچوں کے ہمراہ عید کے لئے میکے میں موجود تھیں۔ عید اور نماز کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نواسیاں اور پوتیاں چھوٹی ماں کے گرد مہندی لگوانے کے لیے جمع تھیں۔ چڑیوں کی سی چہچہاتی پوتیاں چوہدری اکبر کو پیاری تو بہت تھیں مگر وہ دل میں دکھی بھی بہت تھا کہ جب یہ کسی اور کے آنگن میں لگے پیڑ پے جا بیٹھیں تو پھر اس آنگن کا کیا ہوگا۔ بلقیس کو تو یہ دکھ اور بھی زیادہ تھا مگر اوپر تلے چار بچیاں پیدا کرنے کے بعد بہو

کی صحت فی الحال اس قابل نہ تھی کہ کسی اور بچے کی متحمل ہو سکے۔ خورشید بارہا بلقیس کو سمجھانے کی کوشش کرتی کہ رب نے جو دیا ہے اُس پر شکر کرو۔

خورشید کی طرف داری پر اُسے بہو پر اور غصہ آتا مگر بہو چپ چاپ برداشت کر لیتی۔ لیکن آج جانے کیسے بات بڑھ گئی۔ بلقیس نے بچیوں کے شور پر پھر سے بُڑبڑانا شروع کر دیا جس پر بڑی بہو کا دل بھر آیا تو اُس نے رونا شروع کر دیا۔ اس پر خورشید بھی بھڑک اٹھی۔ اُس نے شاید پہلی بار بلقیس سے سخت لہجے میں بات کی تو پہلے سے بھری بیٹھی بلقیس آپے سے باہر ہو گئی اور یوں بہوؤں اور پوتیوں کی آڑ میں اُس نے پچھلے تیس سال کا سارا غبار نکال ڈالا۔ خورشید بہت عرصے سے اُس کے رویے کی تلخی محسوس کر رہی تھی لیکن اُس کا یہ روپ اُس کے لیے نیا تھا۔ بیٹوں اور بیٹیوں کے سمجھانے پر بھی بلقیس پُرسکون نہ ہوئی اور بات بڑھتی چلی گئی۔

خورشید کا بہو کے حق میں یہ جملہ کہ "میں دیکھتی ہوں کہ کون مجبور کرتا ہے بہو کو اُس کی مرضی کے خلاف"، چوہدری اکبر کو بھی طیش دلا گیا۔ وہ اب بھی بلقیس کے روبرو کھڑی اپنی روتی ہوئی بہو کی وکالت کر رہی تھی۔

ہاں ٹھیک ہے تم اگر یہ سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو، کہ میں نہیں چاہتی وہ اپنی جان پر کھیل کر تیری جھولی میں پوتا ڈالے...... اور تو کیسے یقین سے کہہ سکتی ہے کہ اب کی بار لڑکا ہی ہو گا؟ ایک لمحے کے لیے چوہدری اکبر کو بھی خورشید کا یہ رویہ تکلیف دہ لگا۔ وہ غصے سے خورشید کی طرف بڑھا اور اُسے خود بھی احساس نہ ہوا کہ کب اُس کا ہاتھ اُٹھا اور ایک زناٹے دار تھپڑ کی صورت خورشید کے چہرے پر پڑا۔

خورشید سناٹے میں آ گئی، بہوؤں اور بیٹوں بیٹیوں کے سامنے وہ اس تذلیل کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس صورت حال نے سب کو ششدر کر دیا۔

خورشید نے بے یقینی سے چوہدری اکبر کو دیکھا، کچھ دیر یونہی بے یقینی سے دیکھنے کے بعد وہ شکستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بڑھی اور خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ بڑی بہو تیزی سے اُس کے پیچھے لپکی مگر شوہر اُسے بازو سے پکڑ کر واپس لے آیا۔ ننھی بچیاں مہندی والی ہتھیلیاں

پھیلائے ماؤں کے پہلو سے جا لگیں۔ یہ جو کچھ ہوا اُنہیں بالکل سمجھ نہ آیا بس اُنہیں اپنی پیاری دادی سے ہونے والے سلوک سے بہت دُکھ پہنچا تھا۔ چوہدری اکبر کا یہ روپ سب کے لیے نیا تھا۔ بلقیس سمیت اُس کی تمام اولاد خورشید سے اُس کی والہانہ محبت سے واقف تھی پھر ایسا کیا ہوا کہ دیوانگی اور محبت کا یہ نیا روپ سامنے آیا؟ سب کو دم بخود دیکھ کر چوہدری اکبر کے چہرے پر پشیمانی نظر آنے لگی اور وہ سب سے نظریں چراتا ہوا بیٹھک میں چلا گیا اور خورشید کی طرح خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

ایسی عید پہلی بار آئی تھی۔ صبح منہ اندھیرے بڑا بیٹا باپ کے کمرے میں گیا مگر اُسے سوتا بنا دیکھ کر پلٹ آیا اور خورشید کے کمرے کے دروازے پر دستک کے لیے ہاتھ رکھا، مگر دروازہ اندر سے بند نہ ہونے کی وجہ سے آہستگی سے کھل گیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ چھوٹی ماں کمرے میں موجود نہ تھی، بس گہری خاموشی اور اندھیرا تھا۔ بتی جلانے پر معلوم ہوا کہ چھوٹی ماں کمرے سے جا چکی ہے مگر کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُن سب کی زندگیوں سے جا چکی ہے۔

ایسی صبح پہلے کبھی چوہدری اکبر کی زندگی میں نہ آئی تھی، وہ بیٹوں کے ساتھ نماز کے لیے بھی نہ گیا۔ بلقیس نے مدتوں بعد چولہا چوکا سنبھالا، کھسیانی مسکراہٹ اور خوشی چہرے پر سجائے وہ باری باری سب کے پاس گئی، بہوؤں، بیٹیوں کو مبارک اور بچوں کو عیدی دیتے ہوئے اُسے کسی کے چہرے پر خوشی نظر نہ آئی۔ پورے گھر پر ایک سوگ طاری تھا۔ چوہدری اکبر کسی سے نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ تو کھول دیا مگر نہ کسی نے اندر جانے کی جرأت کی اور نہ ہی اُس نے باہر آنے کی ہمت۔ خورشید کہاں گئی کسی کو معلوم نہیں تھا۔ دونوں بیٹے عید کی نماز پڑھ کر بنا کچھ کھائے پیئے چھوٹی ماں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

وہ اُسے تلاش کرتے بھی تو کہاں۔ جہاں تک اُنہیں یاد تھا چوہدری اکبر اور اُن کے علاوہ چھوٹی ماں کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ جب ملک تقسیم ہوا تو وہ اپنے سارے رشتے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

اب کہاں گئی ہوگی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ شام ہوگئی مگر خورشید کا کہیں پتہ نہ چلا۔

دونوں بیٹوں نے ہسپتال اور ایسی جگہیں چھان لیں جہاں حادثاتی طور پر چھوٹی ماں کے ہونے کا امکان ہوسکتا تھا مگر مایوسی کے سوا کچھ نہ ملا۔ چوہدری اکبر بھی سر جھکائے سوچتا رہتا کہ کہاں گئی ہوگی وہ؟ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ تقسیم کے وقت اُس کے خاندان کو کوئی بھی فرد ادھر نہیں آیا تھا۔ وہ اپنی ساری کشتیاں جلا کر اُس کے ساتھ آئی تھی۔ اُسے خورشید کا یوں اپنی زندگی سے چلے جانا بہت دُکھی کرتا۔ وہ اپنے کیے پر کتنا پشیمان تھا یہ اُس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ گھر کے دوسرے لوگ بھی خورشید کے چلے جانے پر دُکھی تھے۔ بیٹیاں تو عید کے اگلے ہی دن واپس چلی گئیں۔ بچیاں ہر وقت شاکی نظروں سے دادا کو دیکھتیں۔ بلانے پر اُس کی گود میں چلی تو جاتیں مگر اُس سے کوئی بات نہ کرتیں۔ اس ساری صورت حال پر کوئی خوش تھا تو وہ تھی بلقیس جو مدت بعد اپنی راجدھانی بلا شرکتِ غیر سنبھال رہی تھی اور یوں تقریباً پانچ سال گزر گئے۔ اب گھر میں کوئی خورشید کے بارے میں بات نہ کرتا تھا مگر اندر ہی اندر اُس دکھ کو محسوس ضرور کرتے۔ چوہدری اکبر نے پانچ سال کیسے گزارے یہ وہ ہی جانتا تھا۔ کسی کو علم نہ ہوا کہ وہ پانچ سال سے نہیں سویا۔ آج بھی اُسے خورشید کے مہندی رچے پاؤں کی آہٹ اور کھنکتی ہنسی بے چین کر دیتی۔

کبھی کبھی اُسے دیکھنے کی شدید خواہش ایک درد کی صورت سینے میں محسوس ہوتی۔ وہ درد کی شدت سے بچوں کی طرح بِلک بِلک کر روتا اور خورشید کے آنے کی دعائیں کرتا۔ مگر پھر یہ سوچ کر سہم جاتا کہ اگر وہ پلٹ آئی تو کیا وہ اُس سے نظر ملا پائے گا؟

کیا وہ اُسے معاف کر دے گی؟

ایسے بہت سے سوال اُس کے دل کا بوجھ بڑھا دیتے اور وہ ساری رات اپنے آپ کو کٹہرے میں کھڑا رکھنے کے بعد صبح پھر آنسو پونچھ کر چہرے پر سختی اور مضبوطی لیے سب کے سامنے موجود ہوتا۔ اُس کا یہ رویہ بلقیس کے لیے باعث اطمینان تھا۔ پہلے اکثر وہ سوچا کرتی کہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے لیے وہ کبھی چوہدری اکبر کو معاف نہیں کرے گی۔ اُسے ہمیشہ اس بات کا گِلہ رہا کے چوہدری اکبر نے ہمیشہ خورشید کو اُس پر فوقیت دی۔ جو دیوانگی اُسے خورشید کے

لیے چوہدری کے رویے میں محسوس ہوتی وہ اُس کے لیے اجنبی تھی۔ دیوانگی تو دور چوہدری اُسے نظر بھر کر دیکھتا بھی کم تھا۔ وہ اکثر خورشید سے اس بات کا گلہ کرتی کہ چوہدری اکبر مجبوراً میرے پاس آتا ہے اور اُسے مجبور کرتی ہے تو۔

جواب میں خورشید اُسے یقین دلاتی کہ ایسا نہیں ہے تم بھی اُس کی بیوی ہو اور بیویوں کے پاس کوئی مجبوری سے نہیں جاتا۔

مگر بلقیس اتنی ناسمجھ نہ تھی۔ اُسے اچھی طرح علم تھا کہ چوہدری اکبر کی زندگی میں اُس کا کیا مقام ہے۔ وہ خورشید کے کہنے پر اُس کے پاس آتا ہے یا بچوں کی ماں سمجھ کر۔ بچوں کی ماں بن کر تو وہ اپنا حق سمجھتی مگر خورشید کی خوشی کے لیے یا اُس کے مجبور کرنے پر چوہدری اکبر کا مجبور ہونا اُسے اچھا نہ لگتا اور آہستہ آہستہ یہ بات اُسے خورشید سے متنفر کرنے لگی۔ اب وہ خورشید کی ساری مہربانیاں بھول کر اُس کے لیے دل میں صرف حسد اور نفرت محسوس کرتی۔ اس حسد اور نفرت میں وہ اس حد تک چلی جاتی اور سوچتی کہ وہ چوہدری اکبر کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور روز قیامت اُس کا گریبان ضرور پکڑے گی۔

مگر اب چوہدری اکبر کے چہرے پر نظر آنے والی لاتعلقی اور خورشید کے حوالے سے اُس کا سرد رویہ چوہدری کے لیے اُس کے دل میں نرم گوشہ پیدا کرنے لگا اور وہ اُسے معاف کر دینے کے بارے میں سوچنے لگتی مگر معاف کرنے کا فیصلہ ابھی اُس نے نہ کیا تھا۔

بھری گرمیوں کے دن تھے، شام کی چائے کی تیاری ہو رہی تھی۔ عصر کی اذان ختم ہونے پر بلقیس وضو کر کے نماز کے لیے تخت پوش پر جا بیٹھی کہ باہر دروازے پر دستک ہوئی۔

سلیم، چوہدری اکبر کا بڑا بیٹا اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ کون ہے؟ اُسے واپس پلٹتے دیکھ کر بلقیس نے پوچھا۔

محمود ہے ماں جی۔

لطیف سٹیشن ماسٹر کا بیٹا؟ بلقیس نے وضاحت چاہی۔

جی! بیٹا ماں کو جواب دے کر مہمان کو بٹھانے بیٹھک کی طرف چل دیا۔

یہ آج کہاں سے آ گیا؟ اس کا باپ تو ریٹائر ہو گیا تھا اور پھر یہ سنا کہ سب واپس گاؤں چلے گئے تھے...... بلقیس بڑبڑائی۔

مگر بعد میں اُس کا بیٹا اُس کی جگہ بھرتی ہو گیا تھا۔ اب یہ اپنے باپ کی جگہ سٹیشن ماسٹر ہے مگر جانے تبادلہ کہاں ہوا ہے اس کا۔۔۔۔ چوہدری اکبر نے جواب دیا۔

مہمان کو بٹھا کر سلیم واپس آیا، بیوی کو چائے کے لیے کہا اور پھر والد کے پاس جا کر اُسے بتایا کہ محمود اُن سے بھی ملنا چاہتا ہے۔

چوہدری اکبر اُٹھ کر بیٹھک میں چلا گیا اور بلقیس نے نماز کے لیے نیت باندھ لی۔

چوہدری اکبر نے رسماً اُس سے اُس کے گھر والوں کا حال چال پوچھا۔ محمود نے بتایا کہ ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصہ بعد ہی والد کا انتقال ہو گیا اور بطور سٹیشن ماسٹر اُس کا تبادلہ کہیں اور کر دیا گیا، بیوی بچے اور ماں گاؤں میں ہی ہیں۔

چوہدری اکبر نے محسوس کیا کہ محمود کچھ پریشان ہے اور بیٹے کا یہ کہنا کہ وہ آپ سے بھی ملنا چاہتا ہے اُسے کچھ عجیب لگا۔

کچھ دیر خاموشی کے بعد محمود نے بات شروع کی!

چاچا جی دراصل میں آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ آپ کو ایک پیغام دینا تھا۔

چوہدری اکبر کو حیرت ہوئی کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو وہ اتنی دور سے بتانے آیا ہے۔

چاچا جی...... میں چھوٹی ماں کا پیغام لے کر آیا ہوں (چوہدری اکبر کے بچوں کی طرح اُن کے دوست بھی خورشید کو چھوٹی ماں ہی کہتے تھے)

چھوٹی ماں کا؟ سلیم نے بے تابی سے پوچھا۔

چوہدری اکبر کو جھٹکا سا لگا مگر اُس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

ہاں چھوٹی ماں کا پیغام...... محمود نے جواب دیا۔

تمہیں وہ کہاں ملیں؟

چھوٹی ماں میری ماں کے ساتھ گاؤں میں پچھلے پانچ سال سے تھیں۔

پچھلے پانچ سال سے چھوٹی ماں تمہارے ساتھ تھی اور تم اب بتا رہے ہو...... سلیم نے خفگی سے کہا۔

مجھے افسوس ہے مگر میں مجبور تھا۔ مجھے انھوں نے سختی سے منع کیا تھا بلکہ وہ اس شرط پر میرے ساتھ رہنے پر تیار ہوئیں کہ میں کسی کو اُن کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔

مگر تمہیں وہ ملیں کہاں؟

پانچ سال پہلے عید کی صبح ریلوے سٹیشن کے بنچ پر۔

مجھے نہیں پتہ کہ اُس دن آپ کے گھر میں کیا ہوا مگر جب میں اُس دن صبح فجر کی نماز پڑھنے نکلا تو بنچ پر کسی خاتون کو بیٹھے دیکھا۔

اور جب نماز پڑھ کر واپس آیا تو وہ مسافر خاتون وہیں موجود تھی۔ حالانکہ ٹرین آ کر جا چکی تھی۔ عید کے دن تو ویسے بھی سفر کرنے والے کم ہوتے ہیں۔ ایسے میں کسی خاتون کا سٹیشن پر موجود ہونا مجھے عجیب سا لگا۔ مجھے پتہ تھا کہ اب دوپہر سے پہلے کوئی ٹرین نہیں آئے گی چنانچہ میں اُس مسافر خاتون کو یہ بتانے اُس کی طرف بڑھا تو میں نے دیکھا کہ وہ چھوٹی ماں تھی اور بنچ پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی، میری پریشانی دیکھ کر انھوں نے بتایا کہ گھر پر سب ٹھیک ہے مگر وہ گھر چھوڑ آئی ہیں کبھی واپس نہ جانے کے لیے۔

میرے اصرار کرنے پر وہ میرے ساتھ کوارٹر میں چلی آئیں اگلی ٹرین آنے تک۔ اگلی ٹرین سے وہ کہاں جائیں گی، اُنہیں بھی معلوم نہ تھا مگر بس وہ یہاں سے جانا چاہتی تھیں۔

مجھے چھوٹی ماں کو دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔ اور پھر اگلی ٹرین آنے سے پہلے میں نے انھیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ میرے ساتھ گاؤں چلیں گی۔ میری ماں اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہونگی کیونکہ میرے والد کی وفات کے بعد وہ بھی اکیلی ہوگئی ہیں۔ ویسے بھی ماں اور چھوٹی ماں ایک

دوسرے کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ سو چارو ناچار اس وعدے پر کہ میں کسی کو اُن کے بارے میں نہیں بتاؤں گا، کسی مستقل فیصلے تک وہ دوپہر کی ٹرین سے میرے ساتھ گاؤں کے لیے روانہ ہوگئیں۔ اُن کے ساتھ کیا ہوا، میں نے کبھی نہیں پوچھا البتہ ماں کو اُنہوں نے کچھ بتایا تھا۔ ماں کے ساتھ اُن کا دل لگ گیا اور وہ آہستہ آہستہ اپنا دُکھ بھولنے لگیں۔

بہت دفعہ میرے دل میں خیال آیا کہ میں آپ لوگوں کو بتاؤں مگر چھوٹی ماں سے کیا ہوا وعدہ مجھے روک دیتا۔ اور پھر میری ماں نے بھی سختی سے منع کیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ وہ لوگ اس کے قابل ہی نہیں ہیں۔

سلیم یہ ساری بات سُن کر جذباتی ہوگیا جبکہ چوہدری اکبر کی حالت پتھر کی سی ہوگئی۔

باہر برآمدے میں بیٹھک کی کھڑکی تلے تخت پر نماز پڑھتی بلقیس نے سلام پھیرا تو اُسے خورشید کا نام سنائی دیا۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا کہ خورشید پھر سے اُس کی زندگی میں واپس آرہی ہے۔ اُس نے تسبیح زور سے مٹھی میں دبالی اور بیٹھک سے آنے والی آوازیں غور سے سننے لگی۔ مجھے ابھی چھوٹی ماں کے پاس لے چلو...... یہ سلیم تھا اُس کا بیٹا۔ جو التجائیہ لہجے میں محمود سے کہہ رہا تھا۔ جبکہ ابھی تک چوہدری اکبر کی آواز بلقیس کے کانوں تک نہ پہنچی تھی۔

محمود مجھے چھوٹی ماں کے پاس لے چلو میں خود اُنہیں منالوں گا۔ سلیم نے بے تابی سے کہا۔ مگر محمود اُسے جواب دینے کی بجائے چوہدری اکبر سے مخاطب ہوا۔

چاچا جی مجھے آپ کو یہ بتانا تھا کہ کل چھوٹی ماں کا انتقال ہوگیا۔

چوہدری اکبر کا سانس رُک گیا۔ اُسے محمود کی آواز دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جب وہ بیمار ہوئیں تو میں نے اور ماں نے اُنہیں بہت سمجھایا اور آپ لوگوں کو اطلاع دینے کی کوشش کی مگر اُنہوں نے مجھے قسم دے دی اور کہا کہ ضرور اطلاع دینا مگر مجھے دفن کرنے کے بعد۔ میں نہیں چاہتی کہ چوہدری اکبر میرا چہرہ دیکھے اور میرے جنازے کو کاندھا دے۔

چھوٹی ماں نے یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری اکبر کو میرا پیغام ضرور دینا کہ "میں نے اسے

معاف نہیں کیا، قیامت کے دن اس کا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ"

اس جملے پر تخت پر پریشان بیٹھی بلقیس نے اطمینان بھری سانس لی۔ وہ ایک بار پھر خورشید کی احسان مند ہونے لگی کہ اُس کی وہ خواہش جو آج تک وہ چوہدری اکبر کے لیے دل میں رکھتی تھی مگر فیصلہ نہ کر پاتی آج وہ بھی خورشید نے پوری کر دی۔

احسان مندی کا یہ لحہ لحہ ہی ثابت ہوا اور اُس نے بڑے خصوع وخشوع کے ساتھ شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے نیت باندھ لی۔

دو نمبر

میونسپل پارک کے کارنر پر پھولدار بیلوں سے ڈھکا سفید گیٹ بیرسٹر خورشید احمد کا گھر۔ دونوں بیٹے کالج جا چکے ہیں۔ سب سے بڑی عفت نے آج یونیورسٹی سے چھٹی کی ہے اور اپنے کمرے میں مرحوم دادا جان کی تصویریں پھیلائے ان کا پلاسٹر ہیڈ بنانے میں مصروف ہے۔ ابھی صرف دس بجے ہیں۔ سعیدہ بیگم کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ صبح سے یہ اب تک ان کا تیسرا جھگڑا ہے۔ پہلے دودھ والے سے اچھا دودھ نہ لانے پر الجھ پڑیں' دوسرا جھگڑا صفائی کرنے والی سے کہ وہ فرش پر کپڑا لگاتے ہوئے جگہ چھوڑ دیتی ہے اور اب وہ خانساماں کو سودا سلف کی فہرست دیتے ہوئے اس پر برس رہی تھیں۔ ہاتھ میں استعمال کی ہوئی صابن کی ٹکیہ تھی۔

''آنکھیں بند کر کے چیزیں خریدتے ہو کیا؟ یا اب پیسے بچانے لگے ہو؟'' خانساماں خاموشی سے سر جھکائے کھڑا تھا کیونکہ اسے علم ہے کہ جب سعیدہ بیگم خود سے فرض کر کے کوئی الزام لگا دیں تو پھر خدا بھی گواہی کے لیے آ جائے تو کچھ فرق نہیں پڑتا اور ساری صفائیاں بے کار چلی جاتی ہیں۔ اس نے تو یہ سلوک بیرسٹر صاحب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ سو، اس کی کیا بساط۔

شور سن کر عفت اپنے کمرے سے باہر نکل آئی۔ خانساماں سر جھکائے خاموش کھڑا تھا اور ماں اسے ڈانٹ رہی تھی۔

''غضب خدا کا اتنا مہنگا صابن خریدا، اور استعمال کرو، تو پتہ چلے دو نمبر ہے۔''

''بیگم صاحبہ میں تو اچھی طرح دیکھ بھال کر لاتا ہوں۔ اوپر سے تو بالکل ایک نمبر دکھتا

ہے۔وہی رنگ وہی خوشبواور وہی لیبل۔''

''ارے چپ رہ۔کیا کریں ہم رنگ اور خوشبو کو جب چیز برتنے میں ہی اچھی نہ ہو۔ ایک بار بھیگا تو ساری خوشبو ختم اور گھل کر آٹا ہو جاتا ہے۔کوئی گُن نہ ہو تو کیا کریں اچھے لیبل کو۔''

نمبر دو کی اس تشریح پر عفت نے مڑ کر ماں کو دیکھا۔اسے لگا کہ نمبر دو چیز کی تشریح کرتے ہوئے اس کی ماں کی شخصیت کی ساری پرتیں کھلی جا رہی ہیں۔اس کی ساری شخصیت بے نقاب ہو کر عفت کے سامنے آ گئی۔

سعیدہ بیگم پچیس برس پہلے بیاہ کر بیرسٹر رشید احمد کے گھر آئیں۔اچھے حسب نسب والے کھاتے پیتے گھرانے کی بیٹی اور پانچ بھائیوں کی بہن جن میں سے چار طویل عرصے سے لندن میں رہائش پذیر تھے۔اپنے حسب نسب اور خاندان کی عظمت پر ہمیشہ انہیں فخر رہا۔شاید یہی فخر اور غرور بعد میں خورشید احمد سے کئی جھگڑوں کا باعث بھی بنا۔بیرسٹر صاحب بچپن ہی سے جمال پرست اور فنونِ لطیفہ کے رسیا تھے۔جوانی میں شاعری کا شوق بھی رہا لیکن بنیادی طور پر شریف آدمی تھے۔ شادی ہوئی تو ایک شریف آدمی کی طرح بیگم پر فریفتہ ہو بیٹھے۔اچھے خاندان کی خوش شکل بی بی تھیں اور ظاہر ہے اتنا حق شوہر پر رکھتی تھیں۔شادی کے کچھ سال تو جوانی کی ترنگ میں گزر گئے۔اوپر تلے ایک بیٹی اور دو بیٹے ہو گئے۔اب سعیدہ بیگم بیرسٹر صاحب کی بیگم کم اور بچوں کی ماں زیادہ ہو گئیں۔خصوصاً دو بیٹوں کے بعد وہ مطمئن ہو گئیں۔گویا ان کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

قدامت پرست گھرانے کی تربیت یافتہ ہونے کے سبب ان کے نزدیک سلائی کڑھائی اور امور خانہ داری کی مہارت پرائے گھر جانے کے لیے کافی اثاثہ تھا۔لہٰذا جب شادی ہوئی، بچے ہو گئے اور ایک عدد شوہر موجود تھا تو ان کی زندگی ہر طرح سے مکمل ہو گئی۔لیکن بیرسٹر صاحب کی طرف بہت کم دیکھتیں لیکن غافل ہرگز نہ تھیں۔نتیجہ یہ کہ بیرسٹر صاحب ہر چوری پر پکڑے جاتے اور پھر سعیدہ بیگم وہ غل مچاتیں کہ خدا کی پناہ۔اب دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔سعیدہ بیگم نے یہ محسوس کیا کہ اب بیرسٹر صاحب کی توجہ ان کی طرف بہت کم ہو گئی

ہے۔لیکن انھوں نے اپنا رویہ پھر بھی نہیں بدلا۔اپنی لاتعلقی اور سرد مہری برقرار رکھی۔پھر بیرسٹر صاحب نے بیگم کی توجہ حاصل کرنے کے لیے گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مداخلت شروع کردی کہ شاید اسی بہانے بیوی سے قربت حاصل ہو سکے۔لیکن بیگم نے ایک بار جو طے کرلیا سو کر لیا۔بقول بیرسٹر صاحب کے بیگم پاؤں تلے چونی داب کے کھڑی ہو جاتی ہیں پھر لاکھوں کا نقصان ہو جائے وہ پاؤں نہیں ہٹاتیں۔بس فخر سے تنی کھڑی رہتی ہیں اور کہتیں ''ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ایک بات جو منہ سے نکل گئی اسے پورا کیا۔جو چیز ایک دفعہ دل سے اتر گئی اسے پھر مڑ کر نہیں دیکھا '' کبھی کبھی بیرسٹر صاحب کو لگتا کہ وہ بھی سعیدہ بیگم کے دل سے اتر گئے ہیں۔ان کی ہر بات اور ہر کام میں سعیدہ بیگم کو کیڑے نظر آنے لگے۔بات بات پر وہ بلی کی طرح غرا کر انہیں دیکھتیں جسے بیرسٹر صاحب نظر انداز کر کے اپنے کمرے میں چلے جاتے۔

جب سے بچے بڑے ہوئے سعیدہ بیگم کی سرمہری میں اضافہ ہو گیا تھا۔وہ دونو جوان بیٹوں کی ماں تھیں۔ان کے خیال میں اب ان کے قدم اور زیادہ مضبوط ہو گئے تھے۔بطور ماں اور بحثیت خاتون خانہ وہ بے مثال تھیں۔ان کے گھریلو رکھ رکھاؤ اور سلیقے کی مثال دی جاتی تھی۔ سب کچھ تھا۔بس کچھ نہیں تھا انکے پاس تو صرف بیرسٹر صاحب کے لیے کچھ نہیں تھا۔ان کے اس سلوک کو دیکھتے ہوئے بچے باپ سے زیادہ قریب ہو گئے خصوصاً بیٹی۔وہ ماں کی طرف سے کیے گئے سلوک کی تلافی کرنے کی کوشش کرتی لیکن بیوی کی بے اعتنائی بیرسٹر صاحب کی برداشت سے باہر تھی۔ان کے مزاج میں ایک چڑ چڑا پن آ گیا تھا۔وہ اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر بچوں پر چلانا شروع کر دیتے۔غصے میں ہوتے تو سعیدہ بیگم بھی محفوظ نہ رہتیں۔بچے بھی اب ان روز روز کے جھگڑوں کے عادی ہو چکے تھے۔رہی سعیدہ بیگم،انھیں کبھی پرواہ نہ تھی۔

پھر ایک دن ایک ہنگامہ خیز خبر آئی کہ بیرسٹر صاحب نے دوسری شادی کر لی ہے۔عالیہ بیگم بیرسٹر صاحب کے کسی دوست کی بے سہارا بیوہ تھیں۔بڑی وضع دار اور نفیس۔تیس پینتیس سال کی عمر۔ایک تو شادی دیر سے ہوئی دوسرے میاں ڈیڑھ سال بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے اس لیے

کچھ زیادہ بیوہ بھی نہ تھیں۔ بیرسٹر صاحب کے پاس کسی ذاتی معاملے میں قانونی مشورہ کے لیے آیا کرتی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے خلا کو محسوس کیا اور بیرسٹر صاحب نے ان سے شادی کر لی۔ الگ سے ایک مکان لے کر دے دیا جہاں جہاں وہ سنت نبوی کے مطابق ایک دن چھوڑ کر شب باش ہونے لگے۔

اس صورت حال پر سعیدہ بیگم کا ردعمل بیان کرنا ممکن نہیں۔ انھیں اس بات کا ملال تو ہرگز نہ تھا کہ بیرسٹر احمد کے ساتھ ایک جذباتی رقابت میں (جو شاید کب کی ختم ہو چکی تھی) کوئی اور بھی حصہ دار بن گیا ہے بلکہ انھیں غصہ بیرسٹر صاحب کی جرأت پر تھا۔ وہ جو انھیں گھر کی فالتو چیز کی طرح بھول بیٹھی تھیں ان کے گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کبھی اتنی جرأت کریں گے۔ جس سلطنت کی وہ بلا شرکت غیر مالک تھیں بیرسٹر صاحب نے کسی اور کو بھی اس کا حصہ دار بنا دیا جس کے حسب نسب اور خاندان کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ بس یہی بات سعیدہ بیگم سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ بچے اس سارے ہنگامے میں سہمے ہوئے تھے۔ عفت جو بڑی بیٹی تھی اسے اس بات کی تو فکر تھی کہ اگر یونیورسٹی میں اس کی کلاس فیلوز کو پتہ چل گیا کہ اس کے والد نے دوسری شادی کر لی ہے تو اسے کتنی شرمندگی اٹھانا پڑے گی۔ لیکن اسے باپ کا یہ فیصلہ غلط نہ لگا۔ اسے اپنی ماں کے رویے کا احساس بھی تھا اور اب دکھ بھی کہ ماں کی ذرا سی توجہ بیرسٹر صاحب کو دوسری شادی سے اور اسے اپنی دوستوں کے سامنے شرمندگی سے بچا سکتی تھی۔ سعیدہ بیگم کا رویہ اور بھی جارحانہ ہو گیا۔ انھوں نے طلاق کا فیصلہ مصلحتاً نہ کیا کہ خاندان کے نام کو بٹہ لگے گا۔ متبادل یہ کیا کہ بیرسٹر صاحب کا حقہ پانی بند کر دیا۔ جس پر انھوں نے عالیہ بیگم کے ہاں مستقل ڈیرے ڈال دیے۔

بہت دن بعد جب بیرسٹر صاحب بچوں سے ملنے آئے تو سعیدہ بیگم نے ان کی شکل دیکھنے سے انکار کر دیا اور باقاعدہ کمرے میں بند ہو گئیں۔ ڈرائنگ روم میں جب وہ بچوں سے ملے تو انھوں نے محسوس کیا کہ دونوں بیٹے خاموش ہیں اور انھیں باپ کے فیصلے سے دکھ پہنچا ہے۔ انھیں دکھ ہونا بھی چاہیے تھا کہ وہ ماں کے بہت قریب تھے۔ لیکن بیرسٹر صاحب کا اپنا دکھ کیا تھا وہ

بیٹوں کونہیں بتا سکتے تھے۔ بیٹی شاید سمجھ سکتی تھی۔ باپ تھوڑا سا شرمندہ ہورہا تھا۔ بیٹی سے برداشت نہ ہوا تو اس نے اس طرح باتیں شروع کردیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ چہرے پر بشاشت سجا کر اس نے باپ سے کہا

''ابو پچھلے ہفتے ہمارے ڈیپارٹمنٹ میں مشاعرہ ہوا۔ میں نے پہلی بار غزل لکھی اور پہلا انعام حاصل کیا۔''

بیرسٹر صاحب کے لیے یہ بات نئی تھی کہ وہ شاعری کرنے لگی ہے۔ کتابیں تو وہ پڑھتی رہتی تھی حالانکہ اس کی ماں کو سخت ناپسند تھا اس کا ہر وقت کتابیں پڑھنا۔ لیکن بیرسٹر صاحب کو اچھا لگتا تھا اور وہ اسے خود بھی اچھی کتابیں لا کر دیتے رہتے تھے۔ شروع میں ان کا خیال تھا کہ وہ عفت کو زیادہ نہیں پڑھائیں گے بلکہ جلد اس کی شادی کردیں گے لیکن ذاتی زندگی کے تجربے نے انھیں اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کردیا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ لڑکی چاہے اچھی خاتون خانہ نہ ہو لیکن اچھی بیوی ضرور ہو جو شوہر کو سمجھے۔ گریجوایشن کے بعد انھوں نے عفت کا ایڈمشن یونیورسٹی میں کروادیا۔ سعیدہ بیگم کے احتجاج کے باوجود۔ اور آج یہ سن کر کہ عفت کو مشاعرے میں پہلا انعام ملا ہے انھیں بے حد خوشی ہوئی۔

بیرسٹر صاحب رہتے تو دوسری بیگم کے ساتھ تھے لیکن ہفتے میں ایک بار بچوں سے ضرور ملنے آتے۔ سعیدہ بیگم تو کمرے میں بند ہو جاتیں لیکن بچوں کے ساتھ وہ اچھا وقت گزار لیتے۔

وقت اسی طرح گزر گیا۔ عفت شادی کر کے اپنے گھر چلی گئی۔ اس کا شوہر اس سے بہت خوش تھا اور یہ بات بیرسٹر صاحب کے لیے باعث اطمینان تھی۔ لیکن بیٹے کی شادی پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا جب بیرسٹر صاحب اپنی دوسری بیوی کے ہمراہ شادی میں شرکت کے لیے پہنچے۔ سعیدہ بیگم کی راجدھانی میں عالیہ بیگم کی آمد ایک طوفان سے کم نہ تھی۔ انھوں نے گھر آئے مہمانوں کا لحاظ کیے بغیر ایک قیامت برپا کردی اور جب ان کے علم میں یہ بات آئی کہ عالیہ بیگم عفت کے اصرار پر آئیں ہیں تو ان کا بلڈ پریشر شوٹ کر گیا اور ان کی حالت بگڑنے لگی۔ عفت ان تمام باتوں

سے بے خبر اپنے ہمراہ عالیہ بیگم کو لیے باہر مہمانوں کو recieve کر رہی تھی۔ عفت کو عالیہ بہت پسند آئیں وہ ان کی شکر گزار تھی کہ انھوں نے اس کے باپ کی بہت سی محرومیاں ختم کی تھیں اور انھیں خوشیاں دی تھیں جس کی توقع وہ سعیدہ بیگم سے کرتے رہے۔ سعیدہ بیگم کی حالت بگڑنے پر ڈاکٹر کو بلوالیا گیا۔ عفت کو جب ماں کی حالت کا پتہ چلا تو وہ پریشان ہو کر ماں کے کمرے کی طرف لپکی۔ چند لمحے بعد عالیہ بیگم بھی جھجکتے ہوئے عفت کے پیچھے چلی گئیں۔ کمرے میں عجیب منظر تھا۔ بیرسٹر صاحب مجرموں کی طرح پلنگ کی پائینتی کھڑے تھے، ڈاکٹر سعیدہ بیگم کا بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد انھیں سکون کا انجکشن لگا رہا تھا۔ سعیدہ بیگم دھواں دار روئے چلے جا رہی تھیں۔ ان کی کنپٹیوں اور ماتھے کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ عفت نے ماں کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو انھوں نے غصے سے چھڑا لیا اور زور زور سے چلانے لگیں۔

''دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔ ارے تم لوگوں کی وجہ سے میں آج تک اس شخص کو برداشت کرتی آئی۔ اس کی عیاشیوں کی پردہ پوشی کرتی رہی، دس سال سوتن کو برداشت کیا۔ صرف تم لوگوں کے لیے۔ اور آج تم نے اس عورت کو میرے برابر لا کھڑا کیا۔''

عفت نے پھر ان کا ہاتھ پکڑ کر ان کا ماتھا چوما۔ لیکن انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے دھکیل دیا۔ اسی وقت ان کی نظر عفت کے ساتھ کھڑی عالیہ بیگم پر پڑی تو ان کا رہا سہا ضبط بھی ختم ہو گیا۔ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انھوں نے غور سے عالیہ بیگم کو دیکھا۔ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ دس سال چھوٹی ہوں گی لیکن اپنی خوش لباسی اور سلیقے سے کیے گئے میک اپ کی وجہ سے ان سے نصف عمر کی دکھائی دے رہی تھیں۔ انھوں نے نفرت سے عالیہ بیگم کو دیکھا۔ خوف سے عالیہ بیگم کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اور وہ سہم کر عفت کی اوٹ میں ہو گئیں۔ سعیدہ نے میاں کی طرف دیکھ کر عالیہ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہی ہے وہ دو نمبر جس کے لیے تم نے مجھے چھوڑا؟ اپنے بچوں کو چھوڑا؟ کیا خاص بات ہے اس میں؟''

پھر انہوں نے ساری وضعداری کو بالائے طاق رکھ کر ہسٹریائی انداز میں بیرسٹر کو مخاطب کیا:

''ارے تم تھے اس دو نمبر عورت کے قابل جس کے خاندان کا پتہ نہ ذات برادری کا۔ تمھیں اچھی، خاندانی اور شریف بیوی کہاں ہضم ہوتی تھی۔''

ان توہین آمیز کلمات خاص طور پر تم کہہ کر مخاطب کرنے پر بیرسٹر صاحب سکتے میں آ گئے۔اور پھر دو نمبر صابن کی طرح سعیدہ بیگم کا لیبل اترا تو ان کا رنگ اور خوشبو سب ختم ہو گیا۔

اس سے پہلے کے وہ عالیہ بیگم پر بھی اسی طرح کے کچھ جملے اچھالتیں عفت نے ان سے بھی زیادہ اونچی آواز میں چلا کر ماں کو خاموش کروادیا۔

''بس کرو اماں۔ بہت ہو گیا۔تیس برس ہو گئے ہمیں یہ تماشا دیکھتے ہوئے۔لیکن اب بس کرو اپنی حالت پر ہی رحم کھاؤ۔آج تم جو واویلا کر رہی ہو۔جن باتوں کے لئے دوسروں کو الزام دے رہی ہو یہ سب کیا دھرا تمھارا اپنا ہے۔''

''سعیدہ بیگم حیرت سے بیٹی کا منہ دیکھنے لگیں۔ان کے رونے کی آواز سسکیوں اور ہچکیوں میں بدل گئی۔

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں اماں۔لیکن افسوس کہ تمھیں احساس ہی نہیں بلکہ تمھیں تو کبھی بھی احساس نہ تھا۔آج جو، ابا کی بے اعتنائی کا گلہ کر رہی ہیں اپنے رویے یاد ہیں آپ کو؟ آپ نے مدتوں ابا کو ایک فالتو چیز سمجھ کر کونے میں پھینکے رکھا۔ مجھے نہیں یاد کہ آپ نے کبھی بھی ان کی چھوٹی سی خوشی کا بھی خیال رکھا ہو۔آپ نے ہمیشہ ان کی جائز اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو اپنی سنجیدگی اور شرافت کی آڑ میں جان بوجھ کر رد کیا۔اماں کیا آپ عالیہ بیگم کی طرح ابا کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا خیال نہیں رکھ سکتیں تھیں؟ جب انھوں نے آپ سے چھوٹی چھوٹی بے ایمانیاں کرنی شروع کیں اگر اس وقت بھی آپ اپنا رویہ بدل لیتیں تو عالیہ بیگم ہماری زندگیوں میں کبھی نہ آتیں۔ اماں شاید آپ کو پتہ ہی نہیں چلا کہ اپنی تمام تر خاندانی وجاہت، ذاتی شرافت اور سلیقے کے باوجود

آپ ابا کی پہلی ترجیح کبھی نہ تھیں، خود ہی تو کہتی ہو کہ برتنے پر چیزوں کے گن کھلتے ہیں ورنہ لیبل اور خوشبو تو ایک سا ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر کے انجیکشن اور بیٹی کی باتوں نے سعیدہ بیگم کے حواس معطل کر دیے اور ان پر نیم بے حوشی سی طاری ہوگئی۔ انھوں نے ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح تکیے پر سر ڈال دیا اور کروٹ بدل لی۔

رات گئے بیرسٹر صاحب اور عالیہ بیگم جب گھر لوٹ رہے تھے تو عالیہ بیگم نے بے حد افسردگی کے ساتھ بیرسٹر صاحب سے کہا

"دوسری بیوی دوسرے نمبر پر ہوتی ہے۔ اسی لیے دونمبر۔"

بیرسٹر نے سٹئیرنگ پر ترچھا ہو کر اس کے گجرا لگے جوڑے پر جھک کر ایک لمبی سی سانس لی۔

"نہیں......تمہارے نمبر آپس میں بدل چکے ہیں۔"

ابکائی

عین اس وقت جب وہ اس سے اظہار محبت کر رہا تھا، اسے ابکائی آئی اور اس نے منہ بھر کے قے کر دی۔ زردی مائل جھاگ دار الٹی سے اس کے اپنے کپڑے تو خراب ہوئے ہی۔ سامنے بیٹھ کر اظہار محبت کرنے والے کے چمکدار جوتے بھی بری طرح لتھڑ گئے۔ وہ بدحواس ہو گیا اور جیب سے رومال نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا جو الٹی کے بعد نڈھال ہو گئی تھی۔

وہ دونوں شہر کے معروف اوپن ایئر کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ اگست کی حبس زدہ شام تھی۔ لوگ بہت کم تھے اور ان کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی کہ اس طرح کے جوڑے ہر شام وہاں موجود ہوتے تھے۔ ذرا دور دوسری میز پر چائے رکھتے ہوئے ویٹر نے لڑکی کو قے کرتے دیکھا تو ان کی طرف آیا۔ لڑکی رومال سے اپنی قمیض کا دامن صاف کر رہی تھی اور لڑکا اپنے لتھڑے ہوئے جوتوں کو دیکھ رہا تھا۔

''ٹشو پیپر اور پانی لے آؤ'' لڑکے نے ویٹر سے کہا۔

''تم تو ٹھیک ہو؟'' پھر اس نے لڑکی سے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' منہ کھولے لمبے لمبے سانس لیتے اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

''لیکن ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔'' وہ اس پر جھک گیا۔

لڑکی خاموش رہی۔ ویٹر پانی اور ٹشو لے آیا۔

''بل بھی لے آؤ۔'' لڑکے نے دوبارہ کہا اور ٹشو سے اپنا جوتا صاف کرنا شروع کر دیا۔

لڑکی نے گلاس میں پانی ڈال کر منہ صاف کیا۔ ہاتھ دھوئے اور کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ بل دینے کے بعد وہ خاموشی سے اٹھ کر چل دیے۔ گیٹ تک انھوں نے کوئی بات نہ کی۔ باہر آ کر لڑکے نے رکشہ روکا لڑکی خاموشی سے رکشہ میں بیٹھ کر چل دی اور لڑکا پیدل ہی فٹ پاتھ پر رکشے کی مخالف سمت چل دیا۔

وہ اسے چھے ماہ پہلے اپنی ایک دوست کے فلیٹ پر ملا تھا جہاں وہ ویک اینڈ گزارنے گئی تھی۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ اسی شہر میں مقیم تھی۔ ہفتہ وار دو چھٹیوں کی وجہ سے اسے ویک اینڈ بڑا طویل لگتا سو وہ اکثر اپنی اکلوتی دوست کے پاس چلی جاتی۔ اس کے ساتھ ویک اینڈ گزارنا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ مقامی کالج میں انگریزی ادب پڑھاتی اور اپنے فلیٹ پر تنہا رہتی تھی۔ اس سے شناسائی کتابوں کے ایک میلے میں ہوئی مگر اب خوب دوستی تھی عمروں میں خاصے فرق کے باوجود۔ وہ بڑی بولڈ اور ذہین خاتون تھی۔ خاتون اس لیے کہ اب وہ لڑکپن کی حدود سے نکل چکی تھی۔ اس کا دہانہ چھوٹا تھا اور نچلا ہونٹ بڑے انگور کی طرح ابھرا ہوا تھا۔ وہ چھوٹی آنکھوں کے باوجود بڑی خوبصورت تھی۔ ذہانت، خود اعتمادی اور ہٹ دھرمی کے باعث وہ اس عمر میں بھی جنس مخالف کے لیے بڑی کشش رکھتی تھی۔ کسی بھی عمر کا آدمی بڑی آسانی سے اس کے خبط میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی دوست کی اس خوبی کی بھی قائل تھی کہ وہ اپنے تمام دوستوں کو تمام تر محبت اور دوستی کے باوجود ایک خاص فاصلے پر رکھتی تھی۔ اس کا حلقہ احباب بڑا وسیع تھا۔

اس لڑکے سے بھی اس کی ملاقات اس کے فلیٹ پر ہوئی جب وہ ویک اینڈ گزارنے وہاں گئی۔ رات وہ ٹی وی لاؤنج میں قالین پر اوندھی لیٹی ایک انگریزی فلم دیکھ رہی تھیں کہ وہ آ گیا۔ اس کی دوست اسے رسمی تعارف کے بعد ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ کچھ دیر بعد وہ ان دونوں کے لیے چائے لے کر گئی تو وہ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھے کسی بات پر ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ چائے بنا کر وہ کمرے سے نکل آئی اور دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگی۔ بہت دیر بعد جب وہ سونے جا رہی تھی تو ڈرائنگ روم سے بدستور نوک جھونک کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسا تقریباً ہر ویک اینڈ پر ہوتا مگر اس

کے ساتھ اس لڑکے نے رسمی جملوں کے علاوہ کبھی اور کوئی بات نہ کی۔ ہمیشہ وہ دونوں اسے ٹی وی لاؤنج میں چھوڑ ڈرائنگ روم میں چلے جاتے اور رات گئے تک ایک دوسرے سے الجھتے رہتے۔ وہ انہیں چائے دیکر خاموشی سے نکل آتی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ لڑکا اس کی دوست کے خبط میں بُری طرح مبتلا ہے۔ وہ وہاں ویک اینڈ گزارنے آتی لیکن اسے گھنٹوں اکیلے بیٹھنا پڑتا۔ اور وہ بےزاری سے بیٹھی ٹی وی دیکھتی اور بار بار چینل بدلتی رہتی۔ جب ڈرائنگ روم سے آنے والی آوازیں تیز ہوجاتیں تو وہ ٹی وی کی آواز اونچی کردیتی۔ اسے ان کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ٹی وی دیکھتے اور جمائیاں لیتے جب وہ بور ہوجاتی تو جا کر سو جاتی البتہ اگلا چھٹی کا دن وہ دونوں مل کر خوب مزے سے گزارتیں۔ دیر تک سونے کے بعد پراٹھے والا ناشتہ کرتیں۔ ایک دوسرے کے سر میں تیل ڈالتیں اور شام کو گھومنے نکل جاتیں۔ ونڈو شاپنگ ان کا محبوب مشغلہ تھا جسے وہ خوب انجوائے کرتیں۔ اگلی صبح اس کی دوست تو کالج چلی جاتی لیکن وہ دو چھٹیوں کے سبب دیر تک سوتی۔ مزے سے اٹھتی تیار ہوکر ناشتہ کرتی اور فلیٹ سے سیدھی کتابوں کی دوکان پر جاتی۔ کتابیں دیکھتی اور اچھی کتاب نظر آتی تو خرید لیتی پھر لنچ تک واپس ہاسٹل آجاتی۔

اس بار جب وہ ویک اینڈ پر وہاں گئی تو حسب معمول وہ بھی آگیا اور ہمیشہ کی طرح اس کی دوست کو ساتھ لے کر ڈرائینگ روم میں چلا گیا۔

اس طرح نظرانداز کیے جانے پر اسے سخت کوفت ہوئی اور اس نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ وہ یہاں نہیں آئے گی۔ پہلے کی طرح اس نے کچن میں جا کر چائے بنائی اور اُنھیں دے کر پلٹنے لگی تو اس لڑکے نے آواز دے کر اسے روک لیا۔ وہ ایک لمحہ رکی اور دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کے دوست کے چہرے پر غصہ تھا جبکہ لڑکا بہت جذباتی ہورہا تھا۔ لڑکے نے درخواست کی کہ وہ بیٹھ جائے۔ وہ بیٹھ گئی مگر اسے کچھ سمجھ نہ آیا کہ مسئلہ کیا ہے اور بیٹھ کر کیا کرے گی۔ وہ سوالیہ نظروں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔ دونوں خاموش تھے اپنے چہروں کے مختلف تاثرات کے ساتھ۔ اس نے اُٹھ کر چائے بنائی اور ان کی طرف سرکاتے ہوئے بولی ''میرا خیال ہے میں چلوں۔''

''نہیں تم بیٹھو۔'' لڑکے نے قدرے سختی سے کہا۔ وہ سہم گئی۔

لڑکے کو اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ اور بولا'' پلیز تم میری مدد کرو۔ اپنی دوست کو سمجھاؤ۔''

اس نے پھر اپنی دوست کی طرف دیکھا مگر بات اسے اب بھی سمجھ نہ آئی۔

''لیکن میں کیا سمجھاؤں مجھے تو کچھ پتہ نہیں؟'' اس نے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا۔

لڑکے نے اسے غور سے دیکھا اور اس کی بے خبری پر حیران رہ گیا۔

لڑکے کی حیرت پر اس نے معصومیت سے کہا'' مجھے واقعی کچھ پتہ نہیں کہ آپ دونوں میں کیا جھگڑا ہے۔''

اس سے پہلے کہ لڑکا حیرت سے نکل کر اسے کچھ بتاتا، اس کی ساتھی نے سختی سے اسے منع کر دیا۔

''دیکھو۔ میری دوست کو درمیان میں مت لاؤ۔ ویسے بھی یہ اتنی mature کہاں کہ اپنے اور دوسروں کے اس قسم کے فیصلے کرے یا انھیں مشورہ دے۔''

''تم جاؤ اور جا کر سو جاؤ۔'' اس کی دوست نے اسے کہا۔ وہ بڑی سعادت مندی سے باہر نکل آئی اور سونے چل دی۔

کمرے سے نکلتے ہوئے ایک نظر اس نے اس لڑکے کی طرف دیکھا جو اس کے لاتعلق رویے اور بے خبری پر ابھی تک حیرت میں مبتلا تھا۔

صبح ان دونوں کے بیچ رات والے موضوع پر کوئی بات نہ ہوئی لیکن دوپہر کے کھانے پر اس کی دوست نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا۔ وہ لڑکا بری طرح اس کی دوست پر فریفتہ تھا اور اس سے شادی پر بضد جبکہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔

وہ خاموشی سے اپنی دوست کی باتیں سنتی رہی لیکن کوئی مشورہ نہ دیا۔ کیونکہ رات اس کے بارے میں فیصلہ کر دیا گیا تھا کہ وہ ابھی اتنی mature نہیں کہ مشورہ دے سکے۔ سو اس نے

اپنا مشورہ اپنے پاس ہی رکھا اور خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ حالانکہ وہ دل میں سوچ رہی تھی کہ اسے شادی کر لینی چاہیے۔ پتہ نہیں اسے کیوں لگا کہ وہ لڑکا اس کی دوست سے محبت کرتا ہے جبکہ اس کی دوست کا موقف تھا کہ ان کی عمروں میں بہت فرق ہے۔ وہ اس سے چھوٹا ہے اور اس وقت صرف جذباتی ہو رہا ہے۔ جذبات میں کیے گئے فیصلے درست نہیں ہوتے۔ لیکن وہ اپنی دوست سے متفق نہ تھی اس کا خیال تھا کہ اس لڑکے کی بات نہ مان کر وہ ایک اچھے شخص کو کھو رہی ہے۔ وہ اندر سے بجھ سی گئی۔ اپنی دوست کے وہ اس فیصلے سے ناخوش تھی۔ رات جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے نیند نہیں آ رہی تھی وہ بوجھل دل سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کی دوست تیاری میں مصروف تھی۔ اسے جاگتا دیکھ کر اس نے اُسے دور سے ہی ہیلو کہا اور ناشتے کے بارے میں تاکید کرنے لگی۔

''میں صبح جا کر ڈبل روٹی لے آئی تھی۔ انڈے فریج میں ہیں۔ کچن میں کٹا ہوا پیاز رکھا ہے۔ چاہو تو آملیٹ بنا لینا۔'' اس نے بالوں کو کلپ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ ''اور ہاں میں نے آج صبح تازہ مکھن بھی نکالا ہے۔ بہت ساری بالائی جمع ہو گئی تھی۔ ضرور کھانا۔''

جب وہ تیار ہو کر صوفے سے اپنا دوپٹہ اٹھا رہی تھی تو اس نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پھر سوتی بن گئی۔ لیکن اس کی دوست جانتی تھی کہ وہ جاگ رہی ہے۔ اس لیے وہ اسے دروازہ اور چابی کے بارے میں ہدایت دینے لگی۔

''دیکھو جاتے ہوئے باہر کا دروازہ زنجیر کھینچ کر بند کر دینا خود بخود لاک ہو جائے گا۔ چابیاں میں لیے جا رہی ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قریب آئی اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر کر اسے خدا حافظ کہا اور کمرے سے نکل گئی۔

بڑی دیر تک وہ کاہلی سے یونہی پڑی رہی۔ نیند پوری طرح سے نہ آنے سے اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ گئی۔ باتھ روم سے آ کر اس نے تھرماس سے چائے نکالی اور پینے لگی۔ پھر اسے تازہ مکھن کا خیال آیا۔

''بڑی سگھڑ ہو گئی ہے۔''اس نے سوچا۔ بالائی ضائع نہیں کرتی بلکہ شیکر میں برف ڈال کر مکھن نکال لیتی ہے۔''

بڑا خوش شکل اور بڑا خوشبودار مکھن تھا لیکن اس کا جی نہ چاہا کھانے کو۔ اس کی طبیعت ویسے ہی خراب تھی۔ اس نے مکھن واپس فریج میں رکھ دیا اور صرف چائے پی۔ پھر وہ تیار ہو کر فلیٹ سے نکل آئی۔ پہلے وہ ہمیشہ ہاسٹل جانے سے پہلے کتابوں والی دکان پر جاتی تھی لیکن آج اس کا جی نہ چاہا۔ وہ سیدھی ہاسٹل آ گئی۔ کھانا کھائے بغیر ہی سو گئی۔ وہ بڑی گہری نیند میں تھی جب کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا اور بتایا کہ اس کا فون آیا ہے۔ وارڈن کے آفس میں اس نے فون اٹینڈ کیا ۔ یہ اس لڑکے کا فون تھا اور آج شام اسے ملنا چاہتا تھا۔ ملنے کا وقت طے کر کے وہ کمرے میں آ گئی۔ اب وہ خوش تھی کہ اس نے اسے mature سمجھا اور اب مشورہ مانگے گا۔ اپنی اہمیت کے احساس سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ضرور اپنی دوست کو قائل کرے گی کہ وہ اس لڑکے کی بات مان لے اور اب تو اسے اس کی اچھائی کا اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ اس نے اسے مشورے کے قابل سمجھا تھا۔ وہ باقاعدہ سوچنے لگی کہ اسے کیسا مشورہ دے۔ اسے افسوس بھی نہ ہو کہ اس نے غلط مشیر کا انتخاب کیا ہے۔ اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے اسے کیا کرنا ہوگا؟ وہ یہ تمام باتیں سوچتی اور ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کرتی رہی۔ لباس کے انتخاب میں بھی اس نے خیال رکھا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی اور سوبر نظر آئے۔ آج اسے ایک اہم مسئلے میں مشیر کا کردار ادا کرنا تھا۔ سو وہ خود کو خاصا اہم سمجھ رہی تھی۔

شام کو جب وہ پہلے سے طے شدہ جگہ پر وہاں پہنچی تو وہ اس کا منتظر تھا۔ وہ اسے دیکھ کر اس کی طرف بڑھا اور ساتھ لے کر اوپن ایئر کیفے ٹیریا کے گوشے کی طرف چل دیا۔ شام خاصی ہو چکی تھی لیکن حبس اور گھٹن بہت زیادہ تھی، ہوا بالکل بند تھی۔

''چائے کے ساتھ کچھ کھاؤ گی۔''اس نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔ صرف چائے۔''لڑکی نے جواب دیا۔

اب وہ دل ہی دل میں جملے ترتیب دینے لگی جو اسے مشیر کی حیثیت سے کہنے تھے۔ لڑکا

چپ تھا۔ لڑکی سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ تھوڑا نروس ہو گیا اور کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

لیکن یہ کیا؟ اگلے ہی لمحے اس نے اس سے اظہار محبت کر دیا۔

لڑکی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا جی بری طرح متلایا اور اس نے منہ بھر کے قے کر دی۔

اس کا اظہار محبت۔ اس کی ابکائی اور قے یہ سب کچھ اتنا اچانک تھا کہ وہ بدحواس ہو گیا۔ زردی مائل جھاگ دار الٹی سے اس کے اپنے کپڑے تو خراب ہوئے ہی سامنے بیٹھ کر اظہار محبت کرنے والے کے چمکدار جوتے بھی بری طرح لتھڑ گئے۔ اس نے رومال نکال کر لڑکی کی طرف بڑھایا جو الٹی کے بعد نڈھال ہو گئی تھی۔ ذرا دور دوسری میز پر چائے رکھتے ہوئے ویٹر نے لڑکی کو قے کرتے دیکھا تو ان کی طرف آیا۔ لڑکی رومال سے اپنی قمیض کا دامن صاف کر رہی تھی اور لڑکا اپنے لتھڑے ہوئے جوتوں کو دیکھ رہا تھا۔

''ٹشو پیپر اور پانی لے آؤ'' لڑکے نے ویٹر سے کہا۔

''تم تو ٹھیک ہو؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''لیکن ابھی تو تم بالکل ٹھیک تھیں۔

لڑکی خاموش رہی۔

ویٹر پانی اور ٹشو لے آیا۔ بل بھی لے آؤ۔ لڑکے نے کہا اور ٹشو سے اپنے جوتے صاف کرنے لگا۔

لڑکی نے گلاس میں پانی ڈال کر منہ صاف کیا۔ ہاتھ دھوئے اور کرسی سے سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔ بل دینے کے بعد وہ خاموشی سے اٹھ کر چل دیے۔ گیٹ تک انھوں نے آپس میں کوئی بات نہ کی، باہر آ کر رکشہ میں بیٹھ کر چل دی اور لڑکا پیدل ہی فٹ پاتھ پر رکشے کی مخالف سمت چل دیا۔

ماریہ

میں گزشتہ دو گھنٹے سے خمدار پتھریلی سڑک پر بلا مقصد گھوم رہا ہوں۔ بھاری لمبا کوٹ پہننے کے باوجود یخ ہوا مجھے ہڈیوں میں اترتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ پہاڑ پر جاڑا اپنے عروج پر ہے۔ چناروں کے سرخ پتے زرد، اور پھر سرمئی ہو کر گر رہے ہیں اور ہوا انھیں دور تک اڑائے لے جا رہی ہے۔

میرے سامنے پہاڑی کو پہلو سے کاٹ کر بنائی گئی بار بار گھومتی سڑک ان آوارہ پتوں سے بھر گئی ہے۔ گہری دھند نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میں ان تمام باتوں سے بے نیاز اپنے اوورکوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس ٹیلیگرام کو مٹھی میں بند کیے پھر رہا ہوں جو کل شام مجھے ملا تھا۔

Maria died in accident burried on 16th December.

مجھے دس سال پہلے کا وہ دسمبر یاد آیا جب اسی سڑک پر وہ مجھے پہلی بار ملی تھی۔ بارش میں بھیگنے کے ڈر سے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے جب میں ہوٹل سے نکلا تو موسم خاصا خوشگوار تھا۔ بادل تو تھے لیکن بارش کے آثار نہ تھے۔ مگر پہاڑوں پر بارش کا کیا بھروسہ۔ ابھی ہلکی بوندیں پڑ رہی ہیں اور چند منٹوں میں زوروں کا مینہ برسنا شروع ہو جائے گا۔ میں نے قدم اور تیز کر دیے۔ پیچھے آنے والی قدموں کی آواز نے احساس دلایا کہ کوئی اور بھی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہی پھولدار سکارف اور سرخ مفلر والی لڑکی تھی جسے میں کل سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے مفلر اپنے کانوں کے گرد اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اس کے ہونٹ اور ٹھوڑی۔ سکارف کی پھولدار

محراب کے نیچے چھپ گئے تھے۔اس کی روشن آنکھیں سامنے سڑک پر جمی تھی اور جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ میرے قریب سے اجنبیوں کی طرح گزر گئی۔ پوسٹ آفس کی ڈھلوان پر ایک دم تیز بارش شروع ہوگئی اور میں اچھا خاصا بھیگ گیا۔ہوٹل پہنچا تو دیکھا وہ لڑکی برآمدے میں کھڑی اپنا مفلر نچوڑ رہی ہے۔ میں نے برآمدے میں پڑی کرسی پر اپنا کوٹ ڈال دیا۔اس نے میرے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا اور سکارف اتار کر بالوں سے پانی کے قطرے جھاڑنے لگی۔

''عجیب بے نیاز قسم کی لڑکی ہے''میں نے جھنجھلاہٹ کے ساتھ سوچا اور کوٹ اٹھا کر اس کے قریب سے گزرتا کمرے کی طرف چل دیا۔

میں ایک روز پہلے ہی اس پہاڑ پر فلسفے کی کانفرنس اٹینڈ کرنے آیا تھا۔ یہ لڑکی وہیں مجھے ملی مگر کئی بار سامنا ہونے کے باوجود مجھے مسلسل نظرانداز کیے جارہی تھی۔

باہر بارش تیز ہوگئی۔ میں نے کمرے میں آکر ہیٹر جلایا اور کپڑے بدل کر رات کے کھانے کے لئے جب ڈائننگ ہال میں آیا تو وہ مجھے تین بوڑھے پروفیسروں کے ساتھ بیٹھی نظر آئی۔ وہ بڑے جذباتی انداز سے بول رہی تھی دور ہونے کی وجہ سے میں اس کی باتیں نہ سن سکا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بتارہے تھے کہ وہ بڑی ثابت قدمی سے اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی ہے۔اگلے دن کانفرنس میں تمام وقت چیونگم چباتی اور ماتھے پر آنے والے بالوں کو بار بار ہٹاتی رہی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اسے فلسفے یا اس کانفرنس سے کوئی دلچسپی نہیں۔شام کو جب میں گھومنے نکلا تو ہوٹل سے تھوڑی دور وہ بنچ پر بیٹھی جھک کر اپنے جوتوں کے فیتے باندھ رہی تھی۔ میں نے بھی اس کے قریب سے لاتعلقی سے گذرنا چاہا کہ اس نے آواز دی۔

''ایک منٹ رکیے''۔میں بے یقینی سے رکا اور مڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ فیتے باندھ کر کھڑی ہوگئی۔''کیا ہم اکٹھے گھوم سکتے ہیں''۔میرے قریب آکر اس نے بڑی معصومیت سے پوچھا

''اگر آپ کا جی چاہے تو''۔میں نے شانے اچکا کر جواب دیا۔

''کیا آپ کا جی نہیں چاہتا''؟اس نے پوچھا

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں''۔ میں تھوڑا نروس ہو گیا

''تو پھر چلیں'' اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ہم چلنے لگے۔

''میرا نام ماریہ ہے میں یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھاتی ہوں''

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں نہیں مانتا۔'' ''تم زیادہ سے زیادہ سکینڈری سکول کی طالبہ لگتی ہو۔''

میری اس رائے پر اس کے سنجیدہ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر ابھری۔

''کیا یہ بات تم مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟''

''ہرگز نہیں۔ کیونکہ ابھی مجھے اندازہ نہیں کہ تم کن باتوں سے خوش ہوتی ہو۔ اور میں یہ بات بھی ماننے کے لیے تیار نہیں کہ تمہیں فلسفے سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔۔۔ کیونکہ تم ایک خوبصورت لڑکی ہو۔''

''کیا خوبصورت لوگ فلسفہ نہیں پڑھ سکتے؟'' مسکراہٹ کی لکیر ہلکی سی ہنسی میں بدل گئی اور وہ چلتے ہوئے میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا ہر نقش بڑا مناسب اور موزوں۔ آنکھوں میں بے پناہ چمک۔ وہ بڑی بے باکی اور جرات سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں گھبرا گیا۔

چند لمحے وہ مجھے دیکھتی رہی اور پھر ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''سنو۔ کیا تم نے میری بات کا برا مانا کہ میں نے تمھیں under-estimate کیا؟''

''نہیں۔''

''تو پھر خاموش کیوں ہو؟''

''اس لیے کے ہم ایک دوسرے کو جانتے نہیں۔'' وہ سڑک کے کنارے پڑے پتھر پر بیٹھ گئی۔

''تو ابھی سے جاننے لگتے ہیں۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

''مثلاً تم مجھ سے میرا نام پوچھو۔''

اس بار وہ زور سے ہنس دی۔ اس کے بائیں گال میں چھوٹا سا بھنور بن گیا۔

''او گاڈ۔ میں تو بھول ہی گئی۔ تم سے اب تک تمھارا نام نہیں پوچھا۔ دیکھو ہوں نا میں فلسفی؟ چلو جلدی بتاؤ اپنا نام کے اس سے پہلے میں پھر بھول جاؤں۔''

''احمد کمال۔ میں سینٹ جانز کالج میں فلسفہ پڑھاتا ہوں۔''

''کیوں؟ تم فلسفہ کیوں پڑھاتے ہو کیا تمھاری شکل کسی فلسفی سے ملتی ہے؟''

اب وہ بدلہ اتار رہی تھی۔ مجھے اس کے لہجے کی کاٹ سے اندازہ ہوا۔

''میں نے کہا کہ میں فلسفہ پڑھاتا ہوں یہ نہیں کہا کہ مجھے فلسفے سے دلچسپی ہے۔''

تو پھر اس کانفرنس میں کیوں آئے؟''

''میں نہیں آیا بلکہ میرے پرنسپل نے زبردستی مجھے بھیجا ہے۔ یہاں آنے میں میری واحد دلچسپی یہ تھی کہ کانفرنس پہاڑ پر ہو رہی ہے۔ مجھے پہاڑ اور پہاڑ کی سردیاں ہمیشہ سے اچھی لگتی ہیں۔ اور پھر تم سے بھی تو ملنا تھا۔ شاید اسی لیے چلا آیا۔''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میرا خیال ہے چلنا چاہیے بادل گہرے ہو رہے ہیں۔''

تمام راستے وہ خاموش رہی۔ کمرے میں آ کر میں نے سوچا کہ شاید اسے میری بے تکلفی پسند نہیں آئی میں شرمندہ ہو رہا تھا۔

اگلے دن برف باری شروع ہو گئی۔ ہر طرف برفیلی روئی کے گالے اڑنے لگے۔ موسم کی اس تبدیلی پر میں کانفرنس کے دوسرے سیشن کی شرکت ٹالنے کے موڈ میں تھا تاکہ سنوفال کا نظارہ کر سکوں۔ میں نے باہر جانے کی تیاری شروع کر دی۔ لیکن جب جانے لگا تو نہ معلوم کیوں مجھے اس کے بغیر جانا اچھا نہ لگا۔ اسی سوچ میں ارادہ ملتوی کر کے میں ہوٹل کے سیمینار ہال میں چلا آیا۔ کانفرنس کے بینر اور تعارفی پوسٹرز کے پس منظر میں وہ مجھے کافی کا مگ تھامے ایک دبلے پتلے شخص کے ساتھ کھڑی نظر آئی جو شکل ہی سے پروفیسر بلکہ فلسفے کا پروفیسر لگتا تھا۔ میں نے ڈیلی گیٹس کے لیے مخصوص کافی میکر سے ایک مگ بھرا اور آخری قطار میں کرسی پر جا بیٹھا۔ وہ دونوں دیر تک باتیں

کرتے رہے اور پھر اٹھ کر ہوٹل کی راہداری میں غائب ہو گئے۔ میں بھی واپس کمرے میں چلا آیا۔

شام تک برف اتنی پڑی کہ ہر چیز سفید ہو گئی۔ میں سنو فال دیکھنے کے لیے تیار ہو کر باہر نکلا تو وہ برآمدے کے جنگلے پر ہتھیلیوں کے بل جھکی ہوئی چاروں طرف پھیلے ہوئے سفید منظر کو دیکھنے میں محو تھی۔

''چلیں؟'' میں نے قریب آ کر کہا۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور خاموشی سے میرے ساتھ چل دی۔ (جیسے سب پہلے سے طے ہو)۔

چند منٹ خاموش رہنے کے بعد اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔

''تم نے آج دن بھر میری طرف دیکھا تک نہیں۔'' میں نے گلہ کیا۔

''میں دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔''

''کیوں؟''

''پتہ نہیں''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''اور کچھ مت پوچھنا۔ میں بتاؤں گی نہیں۔''

ہم نے کافی پی اور خاموشی سے اپنے اپنے کمروں میں واپس آ گئے سونے سے پہلے میں اس عجیب لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر نصف رات گئے مجھے محسوس ہوا کہ میرے کمرے کا دروازہ کوئی بڑی آہستگی سے کھٹکھٹا رہا ہے۔ چند لمحے یقین کرنے کے بعد میں نے دروازہ کھولا تو اسے سامنے پا کر میرا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

وہ مجھے ایک طرف ہٹا کر جلدی سے اندر آئی ایک ہاتھ میرے منہ پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے دروازہ بند کر دیا۔ میں ابھی تک بدحواس تھا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر پلنگ تک آئی اور مجھے کندھوں سے پکڑ کر بٹھا دیا اور خود قریب پڑی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

میں ابھی تک حیرت سے باہر نہ آ سکا اور میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میری کیفیت دیکھ کر وہ ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی منہ پر ہاتھ رکھ کر گھٹی گھٹی ہنسی ہنسنے سے اس کا

چہرہ سرخ ہو گیا۔ حیرت کے بعد اب میری دوسری کیفیت غصے کی تھی۔

"یہ کیا مذاق ہے؟" میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

"شی۔ آہستہ بولو۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟" اب میں نے دبی آواز میں پوچھا۔

"آج پورا چاند ہے۔"

"تو پھر؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا

"پھر کیا۔ دیکھنے چلتے ہیں۔"

اس وقت ۔۔۔ رات کے ڈیڑھ بجے؟" میں نے کمرے میں لگی گھڑی پر نظر ڈال کر پوچھا۔ میری آواز پھر اونچی ہو گئی۔

"آہستہ بولو" اس نے دبی آواز میں ڈانٹا۔

میں نے دیکھا وہ جوتے ہاتھ میں پکڑ کر آئی تھی اور اب ان کے فیتے باندھ رہی تھی۔

"یہ کون سا وقت ہے آدھی رات کو چاند دیکھنے کیا؟"

وہ اٹھ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "کیا تم دن میں چاند دیکھتے ہو؟" اس نے طنز سے پوچھا۔

مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ اور میں نے اس پر قابو پاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اس وقت اتنی ٹھنڈ میں صرف چاند دیکھنے جانا نہایت احمقانہ خیال ہے۔" اس نے غصے سے میری طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

چند منٹ بعد میں برآمدے کی سیڑھیوں پر اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔

اس نے میرے آنے کا کوئی نوٹس نہ لیا خاموشی سے بیٹھی رہی۔

"دیکھو! میں اپنی بدتمیزی پر شرمندہ ہوں۔" میری آواز میں معذرت خواہی تھی۔

وہ خاموشی سے چاند دیکھتی رہی۔

"اور اگر تم نے مجھے معاف نہ کیا تو مجھے بہت دکھ ہوگا۔ میرے لیے سب سے زیادہ

تکلیف دہ بات کسی خوبصورت لڑکی کا ناراض ہونا ہے۔یقین کرو میں تمام رات یا بہت سی راتیں سو نہ سکوں گا۔"

اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی۔

"شکریہ۔تم واقعی بہت خوبصورت ہو" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔لیکن وہ اداس ہوگئی اور بغیر کسی الوداعی اشارے کے اٹھ کر چلی گئی۔

اگلی صبح مجھے شدید حیرت ہوئی جب وہ تمام دن مجھ سے لاتعلق رہی۔وہ نادانستہ یا دانستہ مجھے نہ دیکھتی۔غصے سے میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔شام کو میں اکیلا ہی نکل کھڑا ہوا۔برف باری کے بعد ہوا نے سردی کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا۔میں ریسٹورنٹ کی کھڑکی سے پہاڑی سلسلے پر جمی برف کا نظارہ کرتے ہوئے کافی پی رہا تھا کہ وہ آ گئی اور بے تکلفی سے میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

"ناراض ہو؟" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے روکھائی سے جواب دیا۔میں اس کے مزاج کی آنکھ مچولی سے نالاں ہو چکا تھا۔

"کیوں؟"

"تم کیا سمجھتی ہو خود کو؟" میں نے غصے سے تقریباً چیخ کر کہا۔

"آہستہ بولو۔بہت بری عادت ہے تمہاری۔اتنا اونچے بولتے ہو۔"

اس نے بڑے نارمل انداز میں ٹیبل پر رکھے گلدان کو گھمانا شروع کر دیا۔پھر اس میں سے ایک پھول نکال کر میرے سامنے رکھ کر کہا

"اب آرام سے بتاؤ کیا بات ہے؟"

"تمھیں نہیں پتہ کیا بات ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔

"نہیں" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کیا چیز ہو تم؟ دن بھر تم میری طرف دیکھتی تک نہیں ہو۔"

"لیکن تم کیوں چاہتے ہو کہ تمھیں ہر وقت دیکھا جائے؟" اس نے میرے سامنے رکھا

پھول اٹھا کر پوچھا

اس کے سوال نے مجھے بوکھلا دیا۔

''بولو کیوں چاہتے ہو؟''

میں منہ کھولے بیٹھا تھا میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

''اچھا چلو۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور باہر چل دی۔

وہ غصے میں تھی۔ ''دیکھو مجھے یہ انداز بالکل پسند نہیں کہ کوئی مجھے مجبور کرے کہ میں اسے ہر وقت دیکھوں۔ اور میں اس طرح کے لہجے کی عادی نہیں۔ آئندہ محتاط رہنا۔ تم کہتے ہو کہ تم فلسفہ پڑھاتے ہو۔ دلچسپی نہیں لیتے۔ میرا خیال ہے پڑھانا چھوڑ دو۔ فلسفے میں دلچسپی لو۔ اسے سمجھو، تاکہ زندگی کے بارے میں تمھارا رویہ بدلے۔ انتہائی سطحی رویہ ہے تمھارا۔ پچھلے دو روز تو کانفرنس میں بھی شاید تم نے دلچسپی نہیں لی۔ اب بقایا تین دن بھی تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تم نے مجھے مایوس کیا ہے۔'' وہ افسردگی سے بولی۔

میں بہت شرمندہ ہو رہا تھا۔

اسی رات بہت سوچنے کے بعد میں نے اس کا دروازہ بجانا چاہا تو وہ آہستگی سے کھل گیا۔ وہ لیٹی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے اس وقت اپنے کمرے میں دیکھ کر اسے بالکل حیرت نہ ہوئی۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا

''میں چاند دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ مسکرائی۔ پھر جیکٹ پہن کر میرے ساتھ باہر آ گئی۔ ہم پہلے کی طرح سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔

''چلو آج باہر چل کر چاند دیکھتے ہیں۔''

اس نے اچانک اٹھتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کے ہاتھ کے سہارے اٹھنا چاہا تو یہ سہارا اس نے دوبارہ جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔

آسمان صاف تھا اور چاند دیوار کے گھنے جنگل کے اوپر برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی

بستی پر درخشاں تھا۔ ہم پیچ دار راستوں کی بہت سی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آ گئے۔ وادی کے نشیب میں گھروں کی بتیاں کہیں کہیں روشن تھیں۔ سنسان سڑک پر گری برف دن بھر گزرنے والی ٹریفک کے نیچے دو متوازی لکیروں میں بٹ جم چکی تھی۔ اشتہار کے طور پر لگے ایک بڑے ہولڈنگ کے پاس ہم رک گئے۔

''ماریہ۔ کیا میں تمھیں بتا سکتا ہوں کہ آج مجھے تمھاری ایک بات بہت بری لگی۔''

''وہ کون سی؟''

''یہی کہ زندگی کے بارے میں میرا رویہ بڑا سطحی ہے۔ یہ کیسے کہہ دیا تم نے؟''

ہاں یہ میں نے کہا اور اب بھی کہتی ہوں۔ اس لیے کہ تم چیزوں کو اس طرح دیکھنے کے عادی ہو جس طرح تم چاہتے ہو۔ اور چیزوں پر اس طرح اعتبار کر لیتے ہو جیسی وہ نظر آتی ہیں۔ کیا پتہ لوگ اپنی مرضی سے اس طرح زندہ ہوں جس طرح وہ نظر آتے ہیں۔ چیزیں ویسی نہ ہوں جیسا ہم انہیں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم ہمیشہ دوسروں کو خوش رکھنے کے لیے اپنے آپ سے بالکل مختلف نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً جیسا تم چاہتے ہو کہ میں ہر وقت تمھیں دیکھا کروں اس لئے کہ تم چاہتے ہو۔ شاید مجھے دیکھنا بھی چاہیے کہ لوگوں کو عمومی رویہ یہی ہوتا ہے لیکن میں ایسا نہیں کرتی۔ جب میرا جی چاہتا ہے مجھے ضرورت ہوتی ہے میں تمھیں دیکھ لیتی ہوں۔ میرے رویے بڑے مختلف ہیں۔ میں زندگی منافقت سے نہیں گزار سکتی۔ میں اس طرح زندہ رہتی ہوں جیسے زندگی ہوتی ہے۔ تم سوچو گے کہ میں خود غرض ہوں۔ ہرگز نہیں بلکہ میں نے کبھی دوسروں کا نقطہ نظر بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر شخص کو اپنی خواہش کے مطابق زندگی گزارنے کی عادت پڑے۔ مجھے پتہ ہے کہ ایسی عادتیں بڑی مشکل سے پڑتی ہیں۔ لیکن میں ہمیشہ لوگوں کی مدد کے لیے اس سلسلے میں تیار رہتی ہوں کہ چلیں مجھ سے ہی اپنی عادت کی ابتدا کر لیں۔ میں کبھی نہیں چاہتی کہ لوگ میرے بارے میں اس طرح سوچیں جیسے میں چاہتی ہوں۔''

میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ چاند کی دودھیا روشنی میں وہ بے حد معصوم نظر آ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ اتنی چھوٹی لڑکی ایسی مشکل باتیں کیسے کر لیتی ہے۔''

''میں کوئی چھوٹی ووٹی نہیں۔'' وہ غصے میں آ گئی۔ ''اور نہ ہی یہ مشکل باتیں ہیں۔ زندگی دراصل ہونی ہی ایسی چاہیے۔ لیکن تم نہیں سمجھو گے کہ تم فلسفہ صرف پڑھاتے ہو دلچسپی نہیں لیتے اس میں۔''

''طنز کر رہی ہو۔''

وہ زور سے ہنس دی۔ رات کی خاموشی میں اس کی ہنسی کی کھنک دور تک گئی۔ چاند آسمان کے درمیان میں آ گیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آدھی رات گزر چکی۔ چلو چلتے ہیں۔'' اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

میں کسی فرمانبردار بچے کی طرح اس کے ساتھ چل دیا۔

اس دن کانفرنس کا آخری دن تھا۔ گزشتہ چار روز گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ Session جب شروع ہوا تو وہ خاموشی سے آ کر پچھلی قطار میں میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تم آج ہی چلی جاؤ گی۔؟'' میں نے اپنی نوٹ بک کے کونے پر لکھ کر اس سے پوچھا۔

''نہیں میں ابھی کچھ دن رکوں گی۔'' اس نے اپنی نوٹ بک کے کونے پر لکھ کر جواب دیا۔

پھر ہم نے لکھ کر گفتگو شروع کر دی جس طرح کالج کے زمانے میں کلاس لیکچر کے دوران کیا کرتے تھے۔

''میرا اپنا چھوٹا سا کاٹج ہے۔ میں ہر سال یہاں کچھ دنوں کے لیے آتی ہوں۔ تم چاہو تو میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہو۔'' کافی دیر بعد اس نے لکھا میں نے مسکرا کر اس کی دعوت قبول کی اور پھر وہ لاتعلق ہو کر لیکچر سننے لگی۔

دوپہر تک کانفرنس کا آخری اجلاس ختم ہو گیا۔ ڈیلی گیٹس پھر ملنے کے وعدوں اور ایڈرس

کے تبادلوں کے بعد جب رخصت ہور ہے تھے تو میں نے بیگ اٹھایا اور چھٹی کی درخواست پوسٹ کر کے ماریہ کے ساتھ اس کے کاٹج میں آ گیا۔

''یہ کاٹج میرے والد نے میری ماں کو تحفے میں دیا تھا کیوں کہ انھیں یہ جگہ بہت پسند تھی۔'' اس نے تالا کھولتے ہوئے مجھے بتایا۔

یہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا کاٹج تھا۔ فرنیچر کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ بند رہنے کی وجہ سے کمروں میں عجیب سی بساند اور چیزوں پر گرد تھی۔ اس نے اندر آ کر کھڑکیاں کھول دیں۔ شام تک ہر چیز صاف ستھری اور اپنی جگہ پر تھی۔ وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی اور میں آتش دان میں لکڑیوں کے ٹکڑے ڈال کر آگ جلانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ میں دو کپ اٹھائے میرے روبرو آ کر بیٹھ گئی۔

''تم چائے بہت اچھی بناتی ہو۔ ایسی چائے کو Graduate Tea کہتے ہیں۔'' میں نے چائے کا سِپ لے کر کہا۔

''شکریہ۔ لیکن تمھیں میرے ساتھ رہتے ہوئے ایک پریشانی ہوگی۔''

''وہ کیا؟''

''میں ویجی ٹیرین ہوں۔ گوشت بالکل نہیں کھاتی۔ سو تمھیں بھی سبزیوں پر گزارا کرنا ہوگا۔''

''منظور ہے۔'' میں نے کہا اور وہ مسکرا دی۔

''تمھارے والد کیا کرتے ہیں؟''

''پتہ نہیں اُس نے خشک لہجے میں جواب دیا۔ میں بہت چھوٹی تھی جب وہ مجھے اور میری ماں کو چھوڑ گئے تھے۔ میں نے آج تک اپنی ماں سے ان کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ میری ماں بڑی بہادر عورت ہے۔''

''تم بھی بہت بہادر ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ میں اپنی ماں جیسی ہوں۔''

''ماں کہاں ہے؟''

''وہ شہر میں ہے۔ پہاڑ کا موسم اب اسے سوٹ نہیں کرتا۔ یہاں آ کر اسے سانس کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس لیے بہت کم آتی ہے وہ یہاں۔ البتہ میں ہر سال چھٹیوں کے لیے ضرور آتی ہوں۔ اب بھی مجھے اپنا ریسرچ پیپر مکمل کرنا ہے۔ میں یہاں بڑے سکون سے کام کرتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم مجھے ڈسٹرب نہیں کرو گے۔'' وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھی۔ مجھ سے باتیں کرتی ہوئی وہ کئی بار کچن میں جاتی رہی اور رات کے کھانے تک اس نے اپنے بارے میں مجھے بہت کچھ بتایا۔ مثلاً یونیورسٹی سے فلسفہ کی ڈگری لینے کے بعد اچھے تعلیمی ریکارڈ کے سبب اسے یونیورسٹی میں ہی Contract پر لیکچرر شپ مل گئی۔ اسے پڑھانا اچھا لگتا ہے۔ فلسفے میں دلچسپی ہے۔ تجریدی مصوری اسے بالکل سمجھ نہیں آتی البتہ موسیقی سے اسے لگاؤ ہے اور وہ بہت اچھا پیانو بجاتی ہے۔ آج کل وہ ایک ریسرچ پیپر پر کام کر رہی ہے اور سکالرشپ کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

رات کے کھانے کے بعد وہ ٹائپ رائٹر پر جا بیٹھی۔ میں سونے کے لیے دوسرے کمرے میں چل دیا۔ وہ بہت دیر تک کام کرتی رہی اور میں اس کے بارے میں سوچتا ہوا سو گیا۔ صبح ناشتے کی میز پر ہم دونوں خلاف معمول خاموش تھے۔ کافی دیر بعد میں نے خاموشی توڑی۔

''میرا خیال ہے۔۔۔''

یہ مت کہنا کہ تمھیں مجھ سے کچھ وہ ہو گیا ہے۔'' اس نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی مجھے ٹوک دیا۔

میں اس کی قیافہ شناسی پر حیران رہ گیا۔ پھر اپنی خجالت پر قابو پا کر ہنستے ہوئے کہا۔

''یہ بات نہیں۔ دراصل میں سوچ رہا تھا کہ ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔''

''ہاں اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے برتن اٹھائے اور کچن کی طرف چل دی۔

سارا دن وہ ٹائپ رائٹر پر جھکی کام کرتی رہی۔ شام کو جب ہم سیر کے لیے نکلے تو میں نے کہا۔ ''صبح تم نے کس بری طرح سے میری بات کاٹی۔ حالانکہ میں وہ بات نہیں کہہ رہا تھا جو تم

سمجھی تھیں۔''میں نے گلہ کیا۔حالانکہ بات کچھ ویسی ہی تھی جیسا اُسکا اندازہ تھا۔

''دیکھو مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔تم صبح بالکل وہی بات کہنے والے تھے۔جو میں کبھی تھی اور اب بھی تمھارے دل میں وہی بات ہے۔اس لیے میں بالکل شرمندہ نہیں ہوں اپنے رویے پر۔''

''چلو اگر وہی بات ہے تو تمھیں کیا اعتراض ہے؟''میں نے مفاہمت سے پوچھا

''مجھے ہرگز اعتراض نہیں۔یہ خالصتاً تمھارا ذاتی معاملہ ہے۔تم جس کے بارے میں جو چاہو سوچو لیکن مجھ سے تقاضا مت کرنا کہ میں بھی تمھارے بارے میں ویسا ہی سوچوں گی۔اب یہ میرا ذاتی معاملہ ہے کہ میں تم سے محبت کروں یا اس درخت سے یا اپنے ٹائپ رائٹر سے۔''اس نے راستے میں پڑے ایک پتھر کو ٹھوکر لگائی۔اور پھر میری طرف رخ کر لیا۔

''تم میرے بارے میں جس طرح چاہو سوچو مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔تم اگر مجھے یہ بھی کہو کہ تمھیں مجھ سے نفرت ہے مجھے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔کیوں کہ تمھاری محبت اور نفرت میرے لیے بالکل اہمیت نہیں رکھتی۔''

محبت اور نفرت کے اس تشریحی لیکچر پر کچھ شکستہ ہونے کے باوجود میں نے حوصلہ نہیں ہارا اور مضبوط آواز میں پوچھا''تو تم محبت کو بے کار اور فضول چیز سمجھتی ہو؟''

''ہرگز نہیں۔محبت شاید دنیا کا سب سے خوبصورت تجربہ ہے۔''

''کیا تم نے......''

بہت ذاتی سوال ہے۔''اس نے میری طرف شرارت سے دیکھا۔''چونکہ اب تم دوست بننا چاہتے ہو اس لیے بتانے میں کوئی حرج نہیں۔''

چلتے چلتے ہم ایک پائپ پر بیٹھ گئے جو بلندی پر واقع کسی چشمے کا پانی نیچے لانے کے لیے بچھایا گیا تھا۔

''ہاں۔تم مجھے کیا بتانے والی تھی؟''میں نے سلسلہ کلام پھر سے جوڑ دیا۔

''یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ہم دونوں بہت اچھے دوست تھے۔اچانک اسے

احساس ہوا کہ اسے مجھ سے محبت ہوگئی ہے۔ جب اس نے مجھے بتایا تو مجھے بھی اس کے بارے میں اس طرح سوچنا اچھا لگا۔ پتہ نہیں یہ محبت تھی یا کیا تھا پر سب کچھ بڑا اچھا لگتا تھا۔ بہت سارے دن ایسے ہی گزر گئے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ کبھی مجھے لگتا کہ یہ میرا وہم ہے لیکن واقعی وہ مجھ سے دور ہوتا گیا۔''

''کیوں؟''

''یہ میں نے کبھی نہیں پوچھا تھا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''میں نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میرا رویہ بڑا مختلف ہے دوسرے لوگوں سے۔ سو اس نے جب مجھ سے کہا کہ اسے مجھ سے محبت ہے تو میں نے اس کا یقین کر لیا تھا۔ پھر جب وہ مجھ سے دور ہوا تو میں نے چپ چاپ اس بات کا بھی یقین کر لیا۔ بلکہ اس صورت حال کو بھی خاموشی سے قبول کر لیا۔''

''تمھیں غصہ نہیں آیا اس پر؟'' میں زمین سے ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر نیچے جھاڑیوں میں پھینک دیا۔

''نہیں...... اس لیے کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔ اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ پتہ ہے جب اس نے مجھے کہا کہ اسے مجھ سے محبت ہے اور میں نے اس کی بات کا اعتبار کر لیا تو وہ کتنا خوش ہوا تھا اور اسے خوش دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تم اندازہ نہیں کر سکتے۔''

''کیا وہ اب تم سے محبت نہیں کرتا؟'' میں نے ایک کنکر اور اٹھا لیا۔

''شاید نہیں۔ یا شاید کرتا بھی ہو۔''

''شاید'' میں نے کنکر اٹھا کر نیچے پھینکا۔ یا شاید نہیں۔'' میں نے دہرایا۔ ''اس شاید اور شاید نہیں کی بے یقینی تمھیں پریشان نہیں کرتی۔'' اب میرا رخ اس کے روبرو تھا۔

''نہیں...... اس لیے کہ ہو سکتا ہے وہ مجھ سے الگ ہو کر زیادہ خوش ہو بلکہ مجھے یقین ہے کہ وہ زیادہ خوش ہے۔''

''کیا تم اب بھی اس سے محبت کرتی ہو؟'' اپنے سب تقاضوں سے دستبردار ہو کر اب مجھے اس کے تقاضوں سے ہمدردی تھی۔

''ہاں۔ پہلے سے بھی کہیں زیادہ۔ لیکن تم نہیں سمجھو گے کیونکہ یہ وہ چیز ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنی جڑیں مضبوط کرتی چلی جاتی ہے۔ اب مجھے اس سے کئی گناہ زیادہ محبت ہے اس وقت سے جب وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔''

ہم پائپ سے اٹھے اور پھر چلنے لگے۔ چلتے چلتے میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس شخص کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ چمک جو ایک فاتح کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ ''دیکھو یہ میرا ہی کام تھا جو میں نے کیا اور میں اس پر نازاں ہوں۔''

برف کے ذرے پھر گرنے لگے۔ ہم کاٹج سے کافی دور نکل آئے تھے۔

''اب واپس چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا ''شاید برف باری شروع ہونے کو ہے۔''

''ہاں'' وہ چونک گئی۔ ''واقعی بہت دیر ہو گئی اور برف سچ مچ گرنے لگی ہے۔''

ساری رات برف گرتی رہی۔ صبح ہر چیز برف میں دب گئی۔ کاٹج کا دروازہ کھولنے کے لیے ہمیں کھڑکی کے راستے باہر جا کر برف ہٹانی پڑی۔ تمام دن برف کے سفید گالے روئی کی طرح اڑتے رہے۔ اس دوران ماریہ ٹائپ رائٹر پر اپنا کام کرتی رہی۔ اور میں آتش دان کے سامنے ایزی چیئر پر نیم دراز میگزین کھنگالتا رہا۔ شام ہوئی تو وہ اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ کافی بنا کر ایک میرے سامنے رکھی اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کھڑکی میں کھڑی خاموشی سے باہر دیکھ رہی ہے۔

میں کافی کا مگ اٹھا کر اس کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ مجھے آتا دیکھ کر بولی ''چلو باہر چلتے ہیں۔''

''چلو''

اور ہم تیار ہو کر باہر آ گئے۔ باہر موسم بڑا شدید تھا۔ برف تھم چکی تھی مگر گہرے بادلوں نے آسمان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ہم خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔

''میں رات بھر اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا۔'' میں نے خاموشی توڑ دی۔

''کیا سوچا؟'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

یہی کہ یقیناً وہ بہت اچھا ہوگا جس سے تم اس طرح محبت کرتی ہو۔''

''نہیں۔ بہت اچھا تو نہیں۔ بلکہ دیکھنے وہ تو شاید احمق نظر آتا ہے۔ تمھیں حیرت ہو گی سن کر کہ لوگوں کی اکثریت اسے ناپسند کرتی ہے۔ لیکن وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتا۔ بڑی سے بڑی بات پر بھی وہ ہنستا رہتا ہے اور کبھی چھوٹی سی بات پر ہفتوں بیمار پڑا رہتا ہے۔ وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ زندگی کو سرکس کا ایک کھیل سمجھتا ہے۔ اس کے دوستوں کا خیال ہے کہ اس نے اپنے اوپر ایک جوکر کا خول چڑھایا ہوا ہے۔ دراصل وہ اندر سے اتنا ہی کمینہ ہے جتنا بظاہر وہ بے ضرر نظر آتا ہے۔ لیکن ہے، بہت ذہین اور ذہین لوگ میری کمزوری ہیں۔''

''اب کہاں ہے؟'' میرا تجسس بڑھ گیا۔

''وہیں ہے۔ ہم ہفتے میں ایک آدھ بار ایک دوسرے سے ضرور ٹکراتے ہیں کبھی یونیورسٹی کے برآمدوں میں کبھی بس سٹاپ اور کبھی کتابوں کی دکان پر۔ لیکن ایک دوسرے کو اجنبیوں کی طرح دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ ہماری پانچ سالہ دوستی میں بہت دفعہ ایسا ہوا کہ ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو گئے اور اس طرح ہوئے گویا ایک دوسرے کے لیے non-existant تھے۔ ہم چھ چھ ماہ ایک دوسرے کی طرف نہ دیکھتے۔ پھر اچانک وہ کہیں سے آنکلتا اور یوں ملتا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ میں کبھی ان دنوں کا نہ پوچھتی جب وہ نہ آتا تھا۔ ہم دوستی پھر وہیں سے شروع کر دیتے جہاں چھوڑی تھی۔ بغیر کسی سوال اور جواب کے۔''

''کیا اب وہ پھر اچانک آجائے گا؟''

''میرا خیال ہے اب نہیں۔ کیونکہ اب بہت سارے دن گزر گئے شاید سال سے بھی زیادہ۔''

''عجیب بلکہ بہت ہی عجیب۔ میں تو اسے غیر انسانی رویہ کہوں گا۔''

''پلیز ایسا نہ کہو۔ یہ عجیب ضرور ہے لیکن غیر انسانی نہیں۔ مجھے تو یہ سب اچھا لگتا ہے لیکن تم نہیں سمجھو گے۔ چلو کافی پیتے ہیں۔''

جب ہم کافی پی کر باہر نکلے تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ برف پھر سے گرنے لگی۔

''کیا خیال ہے واپس چلیں یا کچھ اور آگے جانے کا موڈ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جیسا تم چاہو۔'' میں نے راستے کی طرف ہاتھ بڑھا کر کہا۔

''تو چلو تھوڑا اور آگے چلتے ہیں۔''

''آج سردی کم ہے برف کے باوجود۔'' میں نے کہا

''ہاں برف جب گرتی ہے تو ٹھنڈ نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے بعد جب ہوا چلے تو اتنی ٹھنڈ ہو جاتی ہے کہ خدا کی پناہ۔'' اس نے جیکٹ میں ٹھسی ہاتھوں کی مٹھیاں ہلا کر سردی کی شدت کا تاثر دیا۔

''آج بہت خوش ہو۔'' اسے خوشگوار موڈ میں دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''ہاں آج بہت مدت بعد میں نے کسی سے اس کی باتیں کی ہیں۔''

بہت دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ اچانک چلتے چلتے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور الٹے قدموں چلتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''سنو! تم اگر واقعی مجھ سے محبت کرنے لگو اور میں اس کا یقین کر کے تم سے کہوں کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں تو تمھیں کیسا لگے گا؟''

دوسروں کو حیرتوں میں مبتلا رکھنا شاید اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ میں چکرا کر رہ گیا۔ کیا چیز ہے یہ لڑکی؟ سر پر سکارف باندھے وہ مجھے بالکل چھوٹی سی بچی لگی جو الٹے قدموں چلتی ہوئی کسی چیز کے لیے ضِد کرتی ہے۔

''بولو نا!...... تمھیں کیسا لگے گا؟'' اس نے بدستور الٹے قدموں چلتے ہوئے اصرار کیا۔

اب مجھے غصہ آ گیا'' بہت اچھا لگے گا۔ ہا! ہا!'' میں نے ایک کھوکھلا قہقہہ لگایا۔'' مجھے ایسا لگے گا جیسے بادلوں سے اچانک چاند بلکہ سورج نکل آیا ہے۔ برف میں دبی خزاں رسیدہ ڈالیوں پر اچانک پھول اور شگوفے پھوٹ پڑے ہیں اور آسمان سے ستاروں کی بارش ہونے لگی ہے۔'' میں نے ہاتھوں کو ہوا میں لہرا کر منظر کشی کی۔ میری حالت پر وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔ اتنا ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔

''یہ کیا پاگل پن ہے؟'' میں نے بازو سے پکڑ کر اسے ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ ایک دم چپ ہوگئی اور ہتھیلیوں سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

''چلو چلتے ہیں۔'' اس نے کہا اور ہم کاٹج کی طرف چل دیے۔

رات کے کھانے کے بعد جب میں سونے کے لیے اپنے کمرے میں جانے لگا تو وہ بھی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔

آج کام نہیں کرو گی؟ میرا مطلب ہے ٹائپ رائٹر سے رومانس وغیرہ؟''

''نہیں''

''کیوں؟''

''جی نہیں چاہتا۔'' منہ پر کمبل ڈال کر اس نے کروٹ بدل لی۔

میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ سونے سے پہلے میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح واپس چلا جاؤں گا اور ناشتے پر میں نے اسے یہ بتا بھی دیا۔

''ہاں تمھیں چلے جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ برف باری ابھی کچھ دن مزید ہوگی۔۔ اس سے پہلے کے راستے بند ہو جائیں تم چلے جاؤ۔''

جب میں جانے کے لیے تیار ہوا تو وہ مجھے بس سٹاپ تک چھوڑنے کے لیے آئی۔ تمام راستے ہم دونوں خاموش رہے۔ بس سٹاپ پر اکا دکا مسافر تھے۔ کنڈیکٹر نے بتایا کہ ابھی مسافر پورے نہیں ہوئے روانگی میں تھوڑی دیر لگے گی۔

''چائے پیو گے؟'' اس نے پوچھا

''ہاں ضرور۔'' قریب ہی بیٹھے ایک چائے والے سے شیشے کے گلاسوں میں چائے لی اور وہیں برف سے ڈھکے فٹ پاتھ پر کھڑے پینے لگے۔

''تم بہت اچھی میزبان ہو''۔

''شکریہ'' وہ ہلکا سا مسکرائی۔

''تمھاری واپسی کب ہوگی؟''

''دوایک روز بعد''

''میں خط لکھوں گا۔ جواب دینا''۔اس نے اثبات میں سر ہلایا۔اگر تمہارا سکالرشپ منظور ہوگیا تو چلی جاؤ گی؟۔''

ہاں ۔مگر میں ماں کی وجہ سے پریشان رہتی ہوں ۔ بہر حال میں دیکھوں گی ۔اور تم کیا کرو گے جا کر؟''

''میں کیا کروں گا...... میں...... میں فلسفے میں دلچسپی لوں گا۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی ۔اسی وقت بس نے ہارن بجایا۔مسافر پورے ہوگئے تھے۔

''ہنسا کرو ماریہ۔تم ہنستے ہوئے خوبصورت لگتی ہو''۔یہ کہہ کر میں نے بیگ اٹھایا اور بس میں سوار ہوگیا۔اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے خدا حافظ کہا اور منہ پھیر کر چل دی۔

واپس آنے کے بہت دن بعد مجھے اس کا خط ملا۔اس کا سکالرشپ منظور ہوگیا تھا اور وہ انگلینڈ جا رہی تھی ۔اپنی ماں کو ایک عزیزہ کے پاس چھوڑ کر۔

اس کا اگلا خط انگلینڈ سے آیا کہ وہ بہت خوش ہے البتہ ماں بیمار ہے اور ماں کو بلوانے کے لیے کوشش کر رہی ہے میں باقاعدگی سے اس کو خط لکھتا لیکن وہ میرے بہت سارے خطوں کا جواب ایک ہی خط میں تفصیل سے دیتی ۔پھر خطوں میں وقفہ آتا گیا اور طویل ہوتا گیا۔مدت بعد اس کا خط ملا جس میں اس نے لکھا کہ اس کی ڈاکٹریٹ مکمل ہوگئی ہے اور اب وہ ڈاکٹر ماریہ وہیں پڑھاتی ہے۔ماں کو اس نے بلوایا لیکن وہاں جا کر اس کا انتقال ہوگیا۔

اس کے بعد ہم نئے سال یا عید پر ایک دوسرے کو کارڈز بھیجتے لیکن خط کم لکھتے میں نے آخری خط ماں کی تعزیت کا لکھا تھا۔

میری ڈاک میں انگلینڈ سے آنے والا آخری پیغام یہ ٹیلیگرام تھا جو اس کی ایک کولیگ کی طرف سے ملا۔

Maria died in accident burried on 16th December .

ٹیلیگرام کوٹ کی جیب کے اندر میری مٹھی میں بند ہے۔میں نے جیب سے ہاتھ باہر

نکالا۔ دیر تک مٹھی بند رہنے سے ٹیلیگرام بے ترتیب تہوں میں مرجھا چکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس عبارت کو غور سے پڑھا۔ جس نے گھنٹوں مجھے حیرت میں مبتلا رکھا تھا۔ اب مجھے اپنی حیرت پر غصہ آنے لگا ہے۔ یہ حیرت کیوں ہے۔ وہ تو ہمیشہ سے ایسی ہی تھی۔ چونکا دینا اور حیرت زدہ کرنا اس کا خاص انداز تھا اور اب بھی اس نے وہی کیا۔ میں نے ٹیلیگرام کو آخری بار پڑھا اور پھر اس کے چھوٹے چھوٹے پرزے کر کے ہوا میں اچھال دیا۔ کاغذ کے ٹکڑے زرد اور سرمئی پتوں کے ساتھ بگولوں کی شکل میں اڑتے ہوئے ماریہ کی طرح میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

صباحت مشتاق کے افسانوں کو میں سمجھتی ہوں کہ اچھے ادب کے خانے میں رکھا جائے گا۔ نئے لکھنے والوں کے ہجوم میں شناخت قائم کرنا آسان نہیں ہے لیکن صباحت بڑی آسانی کے ساتھ اپنا راستہ بنا چکی ہے۔ ان کے افسانوں میں مجھ کو ایک اہم وصف یہ نظر آیا کہ ان میں آورد نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس خیال سے لکھے گئے ہیں کہ کسی انوکھی تکنیک کا مظاہرہ کیا جائے۔ مصنفہ کی ذہنی پختگی اور اسلوب پر ان کی گرفت بہت واضح ہے۔ موضوعات کا تنوع بھی قابل ذکر ہے۔

جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے صباحت مشتاق جذباتیت سے صاف بچ جاتی ہیں۔ غیر ضروری الفاظ اور فالتو تفصیلات کو ان کے افسانوں میں جگہ نہیں ملتی۔ ان کے بعض جملے اچانک چونکا دیتے ہیں۔

بہر حال ابھی تو اکیسویں صدی ان کی منتظر ہے اور اس کے آغاز میں اردو افسانے کی عمر کے سو سال بھی پورے ہو جائیں گے۔ افسانے کے آنے والے اس عہد میں مجھے یقین ہے کہ صباحت ادب میں ایک اہم مقام حاصل کر لیں گی۔

قرۃ العین حیدر

SANJH
PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN 978-969-593-129-5